عثمانیہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ ادارہ

ادبیات اردو حیدرآباد دکن،

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں مؤلف نے رابندرناتھ ٹیگور کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو دکھایا ہے اور ان کی شاعری کے طبعی اسباب و محرکات، اس کے تدریجی ارتقار، اس کے مختلف پہلوؤں اور دوروں کی خصوصیات پر تبصرہ ہے اور مذہب، سیاست، قومیت، وطنیت، تہذیب و معاشرت اور تعلیم وغیرہ، تمدن کے جملہ اجزار کے متعلق ٹیگور کے خیالات اور ان کی تعلیمات کو پیش کیا ہے، اور ان کی مشن پر روشنی ڈالی ہے ہر دور کی شاعری اور اہم تصانیف پر مختصر ریویو ہے،

قطراتِ شبنم از جناب گوردھن داس صاحب بی اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۴۰ صفحے، کاغذ کتابت، و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ:- گوردھن داس بی اے بیڈن روڈ لاہور،

آج کل کے نوجوانوں میں ادبِ لطیف یعنی شاعرانہ نثر میں تخئیلی مضامین کا بڑا ذوق ہے، لیکن اس صنفِ ادب کیلئے بڑے لطیف ذوق شاعرانہ نگاہ اور فلسفیانہ تفکر کی صورت ہے اور وہ بالکل مضحکہ خیز ہو جاتے ہیں جس کے نمونوں سے آج کل کے رسالے بھرے رہتے ہیں، قطرات شبنم جناب گوردھن صاحب کے مختصر شاعرانہ اور تخئیلی مضامین کا مجموعہ ہے، اور آج کل کے بے معنی ادب لطیف کو دیکھتے ہوئے بہت غنیمت ہے، مصنف کا ذوق ستھرا ہے، اور ان میں ترقی کی کافی صلاحیت ہے،

"م"

جلد ۴۳	ماہ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۳۹ء	عدد ۵

مضامین

شذرات

ایک مجاہد کا ماتم

مولٰنا محمد عرفان صاحب معتمد خلافت بمبئی کی ناگہانی وفات کی خبر اخبارون کے ذریعہ آپ تک پہنچی ہوگی، مرحوم ہزارہ سرحد کے رہنے والے تھے، اور سلسلۂ خیرآباد کے عالم معقولات اور مدرس تھے، ۱۹۲۰ء کی قومی تحریکات نے درس و تدریس کی مسند سے اٹھا کر قوم وقت کے عملی کامون سے ان کو وابستہ کردیا، ان کی سب سے مخلصانہ خدمت ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء مین ملکانون کے فتنۂ ارتداد کے موقع پر ان کی جانبازی، ایثار اور محنت سے ان کے علاقون مین بیسیون میل پیادہ اور بھوکے پیاسے سفر کرنا اور ایک گاؤن سے دوسرے گاؤن مین مارے مارے پھرنا ان کی زندگی کا اہم کارنامہ ہے، اس کے بعد انھون نے جمعیۃ العلماءٔ دہلی سے وابستہ ہوکر جمعیۃ کے کامون کو کچھ زمانہ تک انجام دیا، اور شریف حجاز اور ابن سعود کی لڑائی کے زمانہ مین حجاز جاکر معاملات کی تحقیقات کے لئے نامزد ہوے، پھر ۱۹۲۶ء مین موتمر اسلام کی شرکت کے لئے گئے اور وہان سے واپسی پر وہ بمبئی کی مجلس خلافت کے کامون مین مصروف ہوگئے، اور اسی مصروفیت مین ان کی زندگی کے آخر سال بسر ہوے، ان کی عمر اس وقت پچاس سے زیادہ نہ ہوگی، بلند و بالا مضبوط اور قوی تھے، ایک دفعہ وہ قومی تحریکون کے سلسلہ مین قید بھی ہوے تھے، اور اسی قید مین انھون نے یہ سعادت پائی کہ

حافظِ قرآن ہوے،

مرحوم نہایت دوست پرور، ہنس مکھ، ظریف اور فیاض تھے، صوبہ سرحد سے وہ مدتون جلاوطن رہے، جلاوطنی کا دور ختم ہوا تب بھی وطن جاکر اپنی خدمات کی وسعت کو انھون نے محدود کرنا پسند نہین کیا، تمام عمر مجرد رہے، اور اسی طرح پوری عمر گذار دی، ایک طرف وہ فقیر بے نوا تھے، دوسری طرف حد درجہ غیور اور شریف، غالب کا مصرع آج ہی صادق آیا ہے،

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد جو ابھی شائع ہوئی ہے، اخلاق پر مشتمل ہے، اس مین پہلے تفصیل کے ساتھ اسلام کے فلسفۂ اخلاق کی تشریح کی گئی ہے، پھر حقوق، فضائل، رذائل اور آداب کی ایک ایک کرکے تفصیل ہے، اس کتاب کے ایک باب مین آنحضرت صلعم کے اخلاقی طریقۂ تعلیم کی دلچسپ و دلپذیر تشریح ہے، اور پوری کتاب اس لائق ہے کہ مسلمان آج جب وہ انقلاب کے دروازہ پر کھڑے ہین، اس کا مطالعہ کرین، اور سمجھین کہ قومون کی ترقی و تنزل مین ان کے قومی اخلاق کو کہان تک دخل ہے،

یہ بات بے خطر کہی جاسکتی ہے کہ دنیا مین کوئی قوم سلطنت و حکومت کی اہل ثابت نہین ہوسکتی، جبتک اس قوم کے اکثر افراد اخلاق عالیہ سے متصف نہ ہون، عزم و استقلال، انصاف و دیانت وغیرہ وہ صفتین ہین جن کے بغیر سلطنت و حکومت کا تخیل کرنا بھی مضحکہ خیز ہے، اگر ہماری "قومی حکومت" ناکام ثابت ہوئی تو دیکھئیگا کہ اس کی ناکامی کے وجوہ ان اوصاف سے معرا ہونا ہونگے،

امسال سیرت کی اس جلد کے علاوہ چند اور کتابین دار المصنفین سے چھپکر شائع ہو رہی ہین، تاریخ اسلام

کی پہلی جلد جس میں آغازِ اسلام سے خلافتِ راشدہ تک کے تفصیلی واقعات ہیں (اس کی دس جلدیں انشاء اللہ بہ ترتیب شائع ہونگی)، تاریخِ دولتِ عثمانیہ دو جلدوں میں (شروع سے اس وقت تک کے تفصیلی حالات) تاریخِ اخلاقِ اسلام کی پہلی جلد جس میں اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، قرآنِ پاک اور احادیث کی اخلاقی تعلیمات، اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتوں سے نقد و نظر ہے،

ایک اور کتاب **نقوشِ سلیمانی** کے نام سے زیرِ طبع ہے، اس میں اڈیٹر معارف کی وہ تمام تقریریں اور تحریریں اور مقدمے یکجا ہونگے جو ہندوستانی ادب و زبان کے متعلق وقتاً فوقتاً اس کے قلم اور زبان سے نکلے، امید ہے کہ یہ پچھلی چوتھائی صدی کی ادبی تحریکوں کا کامیاب مرقع ہوگا، ضخامت ۴۰۰ صفحوں کے قریب ہوگی،

۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامہ سے کچھ پہلے ہندوستان میں مولانا اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہما کی تحریک سے مجاہدین کا جو گروہ پیدا ہوا تھا، اور اس گروہ نے ہندوستان میں اسلامی عقائد و اعمال کی اصلاح کا جو کام کیا تھا اسکی پوری تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی تھی، اور جو لکھی بھی گئی تھی وہ زمانۂ حال کے مذاق سے بہت دور تھی، اس کمی کو محسوس کرکے ہمارے نوجوان ندوی فاضل مولوی سید ابوالحسن علی صاحب مدرس دارالعلوم ندوہ لکھنؤ نے جو اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں بڑی تحقیق اور محنت سے سیرتِ احمد شہید کے نام سے ایک نہایت دلچسپ، روح افزا اور ایمان پرور کتاب لکھی ہے جو چھپکر شائع ہو چکی ہے، ضرورت ہے کہ وہ لوگ جو مسلمانوں کے سیاسی ذوق کو سمجھنا چاہتے ہیں، اس کتاب کو پڑھیں، اور ماضی کی یاد سے مستقبل کا فائدہ اٹھائیں، کتاب میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی اور اڈیٹر معارف کے مقدمے اور دیباچے بھی شامل ہیں،[1]

[1] پتہ:- معین الدین صاحب کتب خانہ محمد علی لین، لکھنؤ، قیمت:- عہ

مقالات

بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق

اس مضمون کا پہلا نمبر[1] سیاسیات کی الجھنوں میں پڑکر خطرناک ہو رہا تھا، اسلئے جیسے بھی بنا اس کو وہیں ختم کر دیا گیا تھا، لیکن اتنے دنوں میں غور سے دیکھا تو معلوم ہوا، کہ اب سیاسیات وہ پہلے کے سیاسیات نہیں رہے، اب یہ سننے میں آتا ہے کہ سیاسیات کا اصلی میدان لاکھوں مربع میل کا وہ میدان نہیں ہے، جس کو اگلے لوگ سلطنت و حکومت کہتے تھے، بلکہ یہ دو بالشت کا پیٹ ہے، اسی کی خاطر سب کچھ ہے، اگلے زمانہ کے بھولے بھالے بزرگ کہا کرتے تھے "خوردن برائے زیستن است، نہ زیستن برائے خوردن" یعنی "کھانا جینے کے لئے ہے، نہ جینا کھانے کیلئے" حضرت مسیح کہتے تھے، "کہ آدمی روٹی ہی سے نہیں جیتا" لیکن آجکل کی سیاسیات نے یہ دونوں مقولے جھٹلا دیئے، اب یہ ہے کہ "جینا کھانے کے لئے ہے، نہ کھانا جینے کے لئے"، اور یہ کہ آدمی روٹی ہی سے جیتا ہے، چنانچہ آج کل کے بولشزم، کمیونزم، سوشلزم وغیرہ کی بنیاد زمین پر نہیں پیٹ پر ہے،

پیٹ کیلئے کھانوں میں سب سے زیادہ ضروری کھانا کون سا ہے، لوگ اپنے اپنے تجربہ اور عادت کے مطابق اسکے کئی جواب دے سکتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو میرا خیال ہے، وہی اکثروں کا ہوگا، یعنی یہ کہ کھانوں میں سب سے زیادہ ضروری کھانا "ناشتہ" ہے، صبح سویرے اٹھکر منہ میں کچھ پڑ جانے

[1] ہندوستانی جولائی ۱۹۳۲ء،

سے سارے دن کے لئے ڈھارس ہوجاتی ہے،

یہ عجیب بات ہے کہ "ناشتہ" کے لئے اکثر زبانوں میں بھوک توڑنے کی اصطلاح بن گئی ہے، میں دو زبانیں جانتا ہوں ایک پورب کی اور ایک پچھم کی، یعنی عربی اور انگریزی، دونوں میں یہی بات ہے، اس سے سمجھتا ہوں کہ اور زبانوں میں بھی کچھ ایسا ہی حال ہوگا، عربی میں اس کو "فطور" کہتے ہیں، اسی سے مسلمانوں کا افطار نکلا ہے، اور جس سے افطار کریں اوس کو افطاری کہتے ہیں، فطور کے معنی توڑنے کے ہیں، یعنی روزہ کی بھوک کو توڑنا، ہمارا ناشتہ بھی اسی قسم کا لفظ ہے، فارسی میں اس کے معنی اس "بھوکے" کے ہیں، جس نے صبح سے کچھ نہ کھایا ہو، (مؤید الفضلا و برہان قاطع) اب دیکھئے کہ یہ نام تو اس آدمی کا تھا، جس کے منہ میں صبح سے کچھ نہ پڑا ہو، اور اب ہم اس چیز کو کہتے ہیں، جو صبح سویرے ایسے آدمی کو کھلادی جائے، یعنی شخص کے بجائے چیز کا نام ہوگیا،

اسی معنی میں ایک اور لفظ "نہار" آپ بولتے ہیں، "نہار منہ" یہ بھی فارسی ہے، مگر دیکھئے کہ یہ فارسی ہندوستانی سے ایسا مل گیا ہے، کہ گویا ہندوستانی ہی ہے، اسکی اصلیت "نا آہار" ہے، "نا" نفی کے لئے ہے، اور "آہار" کے معنی غذا کے ہیں، "ناہار" یعنی نہیں کھایا ہوا (برہان قاطع) اب اس سے ناہاری یعنی "نہاری" تیار ہوئی، جو صبح کو نہار منہ کھائی جائے، اور لکھنؤ اور دلی میں یہ خاص چیز ہے، جو بازاروں میں پکی پکائی بہت چٹپٹی ملتی ہے،

"ناہار" سے "آہار" یاد آیا، آہار آٹے کی اُس لئی کو کہتے ہیں، جو کاغذ اور کپڑے پر اس لئے چڑھائی جاتی ہے کہ وہ مضبوط ہوجائے، آپ سن چکے کہ آہار غذا کو کہتے ہیں، جو بدن کی تقویت کا باعث ہوتی ہے، اس سے اس لئی کو بھی کہنے لگے، جو کاغذ اور کپڑے کی قوت کو بڑھا دیتی ہے (برہان قاطع)

ناشتہ کے طور پر جلدی جلدی جو کھانا پہلے تیار کرکے مہمان کے سامنے رکھدیا جائے عربی

میں اسکو "سلفہ" کہتے ہیں، اسی سے "سلف" (اگلے لوگ) کا لفظ نکلا ہے، عربی کا یہ سلفہ ہمارے ملک میں کھانے کے دسترخوان پر تو بار نہ پاسکا، مگر پینے کی یارانہ محفل میں ایک ہزار برس کے بعد اس کو جگہ مل گئی، نورالدین جہانگیر کے زمانہ میں تمباکو امریکہ سے ہندوستان آیا، اور حکیم گیلانی کی پرحکمت ترکیبوں سے چلم، توا، حقہ اور نے کی شکل پیدا ہوئی، یہ تو امیروں کی باتیں تھیں، اس حقہ کی تیاری کے لئے بڑا وقت، بڑا سامان، اور ایک دو ملازم چاہئیں، اور غریبوں کے پاس نہ اتنا وقت نہ اتنا سامان، نہ ملازم، اونھوں نے اپنے ہاتھ سے بھر کر سلفہ جلدی جلدی تیار کرلیا، اور دم لگا کر اپنے کام پر روانہ ہوگئے،

تکلف کے کھانوں کو قابوں میں نکالتے ہیں، عربی میں لفظ "قعب" ہے، اس کے معنی لکڑی کے پیالہ کے ہیں، جو لکڑی کو بیچ میں کھود کر بنایا ئے (لسان) لیکن ترکی میں اور اس سے فارسی میں "قاب" کے معنی مطلق ظرف یا خانہ کے ہیں، اسی لئے عینک کے خانہ کو اور قلمدان کو قاب کہتے ہیں، اور پھر اسی سے کھانے کے بڑے برتن کو بھی ہمارے ملک میں قاب کہنے لگے،

یہی حال "رکابی" کا بھی ہے، "رکاب" فارسی میں ہشت پہل پیالہ کو کہتے ہیں، اس سے "رکابی" بنی، اور اب وہ پھیلے ہوئے چوڑے ظرف کو کہتے ہیں، اور اسی سے ہندوستانی امراء میں رکابدار پیدا ہوئے، جو کھانے کا انتظام کرتے تھے، یا عمدہ عمدہ کھانے تیار کرتے تھے،

روزمرہ کے کھانوں میں قلیہ قورمہ بہت عام چیزیں ہیں، قلیہ کی شکل عربی ہے، مگر معنی عربی نہیں، قلیہ کی عربی شکل قَلِیّة ہوسکتی ہے، عربی میں "قلی" بھوننے کو کہتے ہیں، اس سے قلیہ بن سکتا ہے، اور بھونے ہوئے گوشت کو کہہ سکتے ہیں، ہماری زبان میں قلیہ اس شوربہ دار گوشت کو کہتے ہیں، جس میں کوئی ترکاری پڑی ہو، بلکہ اسی ترکاری کو قلیہ کہنے لگے ہیں، قورمہ تو ترکی معلوم ہوتا ہے،

شوربا تو صاف عربی کا شربہ ہے، مگر معنی بدل گئے ہیں، عربی میں شربہ اوس کو کہتے

ہیں، جتنا ایک دفعہ پی لیا جائے، اس سے ایرانیوں نے شوربا بنا لیا، اور گوشت کے پانی کو کہنے
لگے، انھوں نے شوربا کو پھر شورباج بنا لیا، مگر ہماری ہندوستانی میں شوربا ہی رہا، بگڑا
تو شروا ہو گیا،

اسی عربی شرب پینا کا ایرانیوں نے شراب اور شربت تیار کیا، اور ہم ہندوستانیوں نے قبول کر لیا،
شراب کے عربی معنی ہیں جو چیز پی جائے، یہاں تک کہ قرآن میں دودھ کو بھی کہا ہے، مگر ایرانیوں
نے جسکو شراب کہا ہے متوالی شراب مراد لی، اسی پر یورپی زبانوں میں "سیرپ" تیار ہوا، جو شکر
پڑ کر میٹھا ہو گیا،

لیکن ایرانیوں کے اثر سے ہم نے پانی میں شکر گھول کر جو چیز تیار کی، اسکو شربت کا نام دیا، لفظ
عربی ہے اور معنی عجمی، عربی میں اسکے معنی فقط پینے کے ہیں،

میٹھے کے بعد نمکین چیز یاد آئی، کباب، صورت عربی ہے، معنی عربی نہیں، کبّ عربی میں اوندھے
کرنے کو کہتے ہیں، اب جس گوشت کو اوندھا کرکے آگ پر رکھئے، اس کو کباب کہئے،

کھانے کے بعد تکلفات کی دوسری قسم فرش فروش ہیں،

قالین سے بڑھ کر خوشنما خوبصورت اور مضبوط فرش شاید ہی کوئی دوسرا ہو، جو زمین کے
فرش پر نہیں بیٹھتے، وہ بھی کرسیوں کے نیچے اسکو بچھاتے اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں، مگر یہ کوئی
نہیں بتاتا، کہ یہ آیا کہاں سے؟ ہندوستان میں تو اسکو مسلمان لائے، مگر مسلمانوں کو یہ ملا کہاں؟
تاریخ کا یہ بھید خود اسی لفظ کے اندر چھپا ہے۔

ایشیائے کوچک میں آرمینیہ کے علاقہ میں ایک شہر کا نام قالیقلا ہے، چوتھی صدی ہجری
میں یہ اسلامی حکومت کا آخری شہر تھا، اسکی طرف جب نسبت کی جاتی تھی، تو قالی کہتے تھے
عربی زبان کا ایک مشہور ادیب اور لغوی اسی نسبت سے "ابو علی قالی" کہلاتا ہے، یہ فرش قالین اسی

شہر کی صنعت اور کاریگری ہے، اسی لئے اس کو "فرش قالی" پہلے نسبت کے ساتھ کہا گیا، پھر استعمال
کی کثرت سے اس کا نام ہی قالی پڑ گیا، یاقوت رومی متوفی ۶۲۶ھ اپنے جغرافیہ معجم البلدان میں
"قالیقلا" کے نیچے لکھتا ہے،

وتعمل بقالیقلا هذه البسط	یہ فرش جس کا نام قالی ہے، قالیقلا
المسماة بالقالی اختصروا فی	میں بنایا جاتا ہے، لفظ میں ہلکے پن کیلئے
النسبة الی بعض اسمه لثقله	نسبت میں اختصار مد نظر رکھا ہے یعنی
(ج ، ص۱۷ مصر)	قالیقلائی کی جگہ صرف قالی کہا ہے)

مؤید الفضلاء میں جو فارسی کا قدیم لغت ہے، اس کو "قالی" لکھا ہے، اور ایک شعر نقل کیا
ہے، فارسی شعراء نے بھی قالی ہی باندھا ہے، اور جس چیز کو ہم غالیچہ کہتے ہیں، عجب نہیں کہ وہ قالیچہ
ہو یعنی چھوٹا قالی، اب آخر کا نون "جو قالین میں ہے، وہ "ین" ہے، جو نسبت کے معنی بخشتا ہے،
جیسے رنگ سے رنگین، قالین کے معنی وہ فرش جو قالی کی طرح ہو، لیکن "ی" چونکہ پہلے سے موجود تھی اسلئے
دوسری "ی" نہیں لگی، یہ تحقیق میری ایجاد ہے، معلوم نہیں صحیح ہے یا غلط،

تکلفات کی تیسری قسم مکانات ہیں، پہلے بڑے بڑے محلوں اور ایوانوں میں اور اب بڑی
بڑی کوٹھیوں میں اس حصہ کو جو نوکروں کے رہنے کے لئے بنائے جاتے ہیں، ہماری زبان
میں شاگرد پیشہ کہتے ہیں، بیچارہ مولوی نور الحسن صاحب نیر مرحوم (نور اللغات کے مؤلف) نے
ایک دفعہ مجھ سے استفسار فرمایا کہ اس کو شاگرد پیشہ کیوں کہتے ہیں، میں نے ظرافت سے کہا کہ
مغل درباروں میں جب بادشاہ پیری مریدی کرنے لگے، تو نوکر چاکر چیلہ کہلانے لگے، جس کی
شہادت تاریخوں کے علاوہ دہلی کا کوچۂ چیلان دے رہا ہے، اسی چیلہ کی فارسی شاگرد بنائی گئی،
اور شاگرد پیشہ اس گروہ خدام کا نام پڑا، اور اس سے ان کے رہنے کے حصہ کو بھی شاگرد پیشہ کہنے لگے،

کچھ دنوں کے بعد میں اپنی بڑی بچی شمیمہ بانو کو گلستاں پڑھا رہا تھا، اور وہ حکایت آئی جس میں پردہ اور علم کا مناظرہ ہے،

این حکایت شنو کہ در بغداد　　رایت و پردہ را خلاف افتاد

علم شاہی نے جھک کر پردہ شاہی سے شکایت کی، کہ سفر میں اور لڑائیوں میں تو مارا مارا میں پھرتا ہوں، اور قرب سلطانی تم کو حاصل ہے، تم نازنین کنیزوں کے ہاتھوں میں رہتے ہو اور

من فتادہ بدست شاگرداں،

اس سے خیال آیا کہ شاہی ملازمین اور خدم و حشم کے معنوں میں یہ پرانا لفظ ہے، اور اسی سے شاگرد پیشہ ہے، اور ہماری زبان میں محلوں کے اس حصہ کو کہنے لگے، جو خاص طور سے ان کے لئے بنائے جاتے ہیں،

ایک ہندوستانی لفظ کی اصلیت پر مجھے بڑا تعجب آیا، ایک دفعہ میں عربی کا مشہور لغت تاج العروس دیکھ رہا تھا، کہ لفظ "رازؔ" پر نظر پڑی، اس کے معنی اس میں استاد اور ماہر کے لکھے تھے دفعۃً میرا دھیان اپنے ہندی لفظ راج اور راجگیر (معمار) کی طرف گیا، لیکن یقین نہیں آتا تھا، کہ عربی کا ایسا لفظ جو عربی میں بھی کتابوں اور تحریروں میں برتا نہ گیا ہو، وہ ہماری ہندوستانی میں کیسے آگیا ہوگا، لیکن دل یہی کہتا تھا، کتابیں الٹیں پلٹیں، دیکھیں، مگر سراغ نہ لگا، اس سال کی گرمیوں کی تعطیل میں برادر عزیز پروفیسر نجیب اشرف ندوی سے پٹنہ میں نصاب الصبیان کی طرح کا ایک قلمی رسالہ فارسی عربی ہندی کا ملا جس میں فارسی اور عربی الفاظ کے مقابل ہندی الفاظ جمع کئے گئے ہیں، اور شاید کسی ایرانی یا پارسی کی تصنیف ہو، مصنف کا نام اور زمانہ نہیں دیا ہے، رسالہ کا نام لسان فارسیات لکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ہندوستان کے کسی نو وارد ایرانی کے لئے لکھا گیا ہو، تصنیف کا مقام گجرات ہے، اس میں پیشہ وروں کا باب دیکھ رہا تھا کہ لفظ راجگیر پر نظر پڑی، جس کے معنی

اس نے "کرَیا یعنی کرنے والے" کے لکھے تھے، دل نے کہا مدت کا کانٹا آج نکل گیا، اور معلوم ہوا کہ صحیح لفظ راجگر ہے، پھر بھی پوری تشفی نہ ہوئی، خدا بخش خاں کے کتب خانہ میں چلا گیا، فارسی لغت کی کئی کتابیں نکلوا کر دیکھیں، مطلب کا پتہ نہ پایا، آخر فرہنگ رشیدی عبدالرشید ٹھٹوی میں یہ عبارت نکلی،

راز معمار و سرداران بگلکاراں ہندی راج گویند لیکن بدیں معنی عربی است عسجدی گوید

بیکے تیر ہمہ فاش کند ستر حصار　　در بر و کردہ بود فیر گل کار راز

اس عبارت نے پوری تشفی کر دی، واپس آکر برہان قاطع میں دیکھا، تو یہ لکھا پایا،

"و بنا و گل کار را نیز گویند و بعربی طیان خوانند و بعضے گفتہ اند راز در عربی کلانتر و بزرگ بنایان باشند"۔

یعنی جس معنی میں ہم مستری کا لفظ بولتے ہیں،

اچھا تو پھر مستری کیا لفظ ہے، خیال جاتا ہے، کہ یہ اصل میں مسطری ہے، مِسطر اوس آلہ کو کہتے ہیں، جس سے سطر سیدھی کیجاتی ہے، پرانے زمانہ میں ایک موٹے کاغذ پر موٹے تاگہ کو سیدھ سے ناپ کر آج کل کے رولدار کاغذ کی طرح سی دیتے تھے اور اس پر لکھنے کے کاغذ کو دبا کر سطروں کو ابھارتے تھے، تاکہ لکھنے میں سطریں سیدھی ہوں، یہ تو کاغذ کی بات چیت ہوئی، عمارتوں میں دیواروں کی سیدھ قائم کرنے کے لئے جس آلہ سے کام لیا جاتا تھا، وہ بھی مسطر ہوا اور اوس مسطر سے جو ماہر فن دیکھ بھال اور ناپ جوکھ کر عمارات کی دیواروں کی سیدھ درست کرتا تھا وہ مسطری کہلایا، اور پھر جب وہ ہندوستانی زبانوں سے ادا ہوا تو مسطری کا مستری ہو گیا، اور اب وہ ہماری زبان کا لفظ ہے، اور ماہر کاریگر کے معنی میں بولا جاتا ہے،

بڑھیوں کی بول چال میں ایک لفظ "خراد" اور "خرادنا" ہے، میز کرسی یا پلنگ وغیرہ کے

پایوں کو چھیل کر کہیں موٹا، کہیں پتلا، کہیں گاؤ دم وغیرہ مختلف شکلیں دیتے ہیں، یہ خالص عربی لفظ خرط ہے، عربی میں اس کے معنی لکڑی کے اس طرح چھیلنے کے ہیں، کہ اسکی اوپری پرت اتر جائے اس سے خراط بنا یعنی وہ آلہ جس سے لکڑی کو اس طرح چھیلا جائے، وہ خراط ہمارے ہاں خراد ہوا، اور اس سے خراد پر چڑھانا محاورہ اور خرادنا مصدر بنا، یہ لفظ اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے، کہ لکڑی کی یہ صنعت کاری مسلمانوں کے ذریعہ ہندوستان میں آئی اور پھیلی،

معماروں کے ایک ضروری آلہ کا نام ہماری زبان میں ساہول ہے، لمبے تاگہ میں ایک وزنی لوہے یا دھات کا گول لٹو سا بندھا ہوتا ہے، اسکو نیچے لٹکا کر اونچائی سے دیوار کی سیدھ دیکھتے ہیں، خوارزمی نے مفاتیح العلوم میں ایک آلہ کا نام شاقول لکھا ہے، اور اسکی تشریح یہ کی ہے ہو ثقل یشد به فی طرف حبل یمده سفلا یحتاج الیه النجارون والبناؤن (لیڈن صفحہ ۲۵۵) یعنی وہ ایک بوجھل چیز جو رسی کے کنارے باندھ کر نیچے لٹکائیں، اسکی ضرورت بڑھیوں اور معماروں کو ہوتی ہے، اس تشریح سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہندی ساہول کی عربی صورت شاقول ہے، اور عربی میں ثقل کے معنی وزن کے لکھے ہیں، مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شاقول ش سے نہیں بلکہ ثاقول ث سے ہو، یعنی ثقل اور بوجھ کے معنی میں، مگر ہیئت کی کتابوں میں بھی شاقول ہی دیکھا گیا ہے، کیا وہاں بھی تصحیف ہوئی ہے،

اسی کتاب میں بڑھیوں کے ایک اوزار کا نام "الکونیا" بتایا گیا ہے، اور اسکی تشریح یہ کی ہے کہ یقدرون بها الزاوية القائمة، (ص ۲۵۵) یعنی اوس سے زاویہ قائمہ نکالتے ہیں، کوئی کچھ کہے ہو نہ ہو یہ لفظ "کونیا" ہے، جس کو آج بھی ہمارے کاریگر بولتے اور برتتے ہیں اب اس کا تلفظ "گُنیا" ہے یعنی وہ آلہ جس سے کونہ (زاویہ) ناپیں یہ ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ کی دو لکڑیاں ہوتی ہیں، جن کو بخط مستقیم جوڑ کر گوشہ (زاویہ قائمہ) نکالتے ہیں، اور اسکی صورت یہ ہوتی ہے، ◺

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہے، تعجب ہوتا ہے کہ یہ لفظ اتنے پرانے زمانہ میں ہندوستان سے غزنویوں کے زمانہ میں وسط ایشیا تک کیسے چلا گیا،

اس کے بالمقابل ایک دوسرا لفظ ہے، جو وسط ایشیا سے ہندوستان آیا ہے، یہ جہاز کا لفظ ہے، جہاز دیکھنے میں تو عربی ہے، مگر جس معنی میں یہ ہماری زبان میں بولا جاتا ہے، وہ قطعاً ہندوستانی یا ہندوستانی فارسی ہے، اصل میں اسکے لفظی معنی "سامان کرنے" کے ہیں، اس سے تجہیز بنا، جسکے جہازیوں میں یہ معنی پیدا ہوئے، کہ کشتی میں سامان رکھ کر کہیں بھیجنا، یہ اصطلاح تیسری صدی ہجری میں پھیل چکی تھی، بزرگ بن شہریار کے سفرنامہ میں ہے،

إنه جهز مركبا لـه الى الزابج — اس نے اپنا ایک جہاز سامان لاد کر جاوہ بھیجا،
(صفحہ)

یہ تو دریائی اصطلاح ہوئی لیکن اس کے سو برس بعد یہ لفظ وسط ایشیا میں خشکی کے سامان تجارت کے معنوں میں سننے میں آتا ہے، حدود العالم میں جو ۳۷۲ھ کی تصنیف ہے، یہ لفظ ان معنوں میں بار بار آیا ہے، شروع شروع میں تو مجھے تعجب ہوا کہ یہ جہاز خشکی میں کیسے چلا، بعد کو سمجھ میں آیا کہ اب یہ لفظ سامان کرنے کے معنی سے قطع مسافت کر کے لفظ "سامان" کی منزل میں پہنچا ہے،

"وجہازہائے ہندوستان بدیں شہر کہا افتد...... و آنجا بردہ ہندو جہاز ہندوستان افتد، صفحہ ۴۴ (ایران)

اس سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ یہی جہاز بعد کو خشکی سے تری میں آگیا، اور سامان تجارت کے بجائے سامان تجارت لے جانے والے جہازوں کو خود جہاز کہنے لگے، ہندوستان میں اکبر کے زمانہ میں فرشتہ نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے،

دگفتہ، فرنگیاں جہازات متردد ساختند، (جلد ۲ صفحہ ۳۷۱ نولکشور)

اب ہماری زبان میں یہ لفظ مطلق جہاز کے معنی میں بولا جانے لگا، اور سامان تجارت اس سے رخصت ہوگیا،

اسی سے ہماری زبان میں خوشی اور غم کے دو لفظ نکلے ہیں، ایک "جہیز" اور دوسرا "تجہیز" جہیز اس سامان کو کہتے ہیں جو شادی میں باپ کی طرف سے لڑکی کو ملتا ہے، اس معنی میں یہ لفظ بھی خالص ہندوستانی ہے، اسکی اصل جہاز ہے "سامان دنیا" یا "سامان کرنا" فارسی کے قاعدہ سے الف میں امالہ ہو کر جہاز سے جہیز ہو گیا ہے، اور اس جہیز پر اب کسی عرب یا ایرانی کا قبضہ نہیں رہا،

جہاز مردہ کے کفن دفن کے سامان کو بھی عربی میں کہتے ہیں، جس سے مصدر "تجہیز" بنا یعنی سامان کرنا اس سے ہماری زبان میں "تجہیز و تکفین" کا لفظ پیدا ہوگیا،

ذرا ذرا سی مناسبت سے دیکھئے تو کیسے کیسے لفظ بنتا اور معنی بدلتا ہے، ذرا اسی "ذرا" پر غور کیجئے کہ کیا یہ عربی کا "ذرہ" نہیں جسکو آپ "ذرۂ بے مقدار" کی صورت میں اچھی طرح پہچانتے ہیں، مگر استعمال کی کثرت سے مخفف ہو کر ذرا بہت ہی تھوڑے کے معنی میں ہو گیا، اور ایسا ہو گیا، کہ اب اسکو ذرہ سے ذرا بھی تعلق نہیں رہا،

ہماری زبان میں ایک لفظ مضمون کی "سرخی" یعنی عنوان ہے، دیکھئے تو یہ سیاہی سے سرخی کیسے بن گیا، بات یہ ہو کہ پہلے زمانہ میں قلمی کتابوں میں باب اور عنوان کو امتیاز کے لئے سرخی سے لکھا کرتے تھے، اب ہمارے زمانہ میں جب چھاپا ایجاد ہوا، تو خود باب کے یا مضمون کے عنوان کو سرخی کہنے لگے، چاہے آپ اسکو سیاہی سے ہی لکھیں، اس لفظ کی یہ توجیہ تو پہلے ہی سے ذہن میں آ رہی تھی، مگر اتفاق سے ایک پرانی قلمی کتاب سے سند بھی ہاتھ آگئی، تو اپنے ذہنی الہام پر تصدیق کی مہر لگ گئی، شیخ نصیر محمود چراغ دہلی کے مرید سید محمد حسنی اپنے مکتوبات میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"کیفیت دیباچہ کہ بقلم مبارک آن محبوب نبشتہ بودند، برائے سرخی نبشتن آن سپیدی نبشتہ عین فرستادہ شدہ است در دیباچہ بنویسند...... ذات لفظ صلوٰۃ سرخی بنویسند، (کتبخانہ حکیم عبد العزیز مشرقی جالندھر شہر)

کاغذات کی مسل (م، س، ل،) ایک عام دفتری اصطلاح ہے، اسکی اصل عربی لفظ مثال ہے، سرکاری شاہی کاغذات کی اصل تو دفتر میں رہتی تھی، اور اسکی بعینہٖ نقل (مثال) لوگوں کے پاس بھیجی جاتی تھی، اس سے مثال کے دوسرے معنی فارسی میں شاہی فرمان کے پیدا ہوئے، اور اسکی جمع "امثلہ" اور "مُثُل" بنی، مثال اور مُثُل نے مسل کی ہندی شکل اختیار کی، مثال اور امثلہ کا استعمال غالباً سلجوقیوں کے زمانہ سے رواج پایا، تاریخوں میں کثرت سے یہ لفظ آتا ہے،

نستعلیق، ایک خاص فارسی خط کا نام ہے یہ اصل میں "نسخ" اور "تعلیق" کی ہندی ترکیب ہے، ہندی ترکیب کا خاصہ ہے کہ جب دو لفظ ملا کر ایک بنائے جاتے ہیں، تو بیچ کی ایک دو حرف لفظ کو ہلکا کرنے کے لئے گرا دیتے ہیں، اس طرح نسخ و تعلیق مل کر نستعلیق بنا، عربی میں نسخ لکھنے اور نقل کرنے کو کہتے ہیں، اس مناسبت سے اہل عجم نے عربی خط کا نام نسخ رکھا، تعلیق اور تعلیقہ کے نام سے اس نے فارسی شکل اختیار کی، اور ان دونوں سے مل کر نستعلیق خط بابر کے زمانہ میں بنا، یہ وہی خط ہے، جسمیں آج کل اردو لکھی جاتی ہے، یہ خط دوسرے شکستہ وغیرہ خطوں کے مقابلہ میں بہت بنا کر نہایت تکلف سے ٹھہر ٹھہر کر لکھا جاتا ہے، اس سے نستعلیق آدمی اور نستعلیق بول چال کی شکلیں پیدا ہوئیں، چراغ ہدایت میں ہے:۔

"نستعلیق گوئی حرف را ساختہ گفتن، و عبارت را بتکلف ادا ساختن اشرف گوید،

زنستعلیق گو یا قوت لب، ریحان خط وا غم،

اس سے ہماری زبان میں یہ وسعت پیدا ہوئی، کہ نستعلیق لباس نستعلیق چال، اور نستعلیق

بول چال کہنے لگے،

بعض لفظوں کی ظاہری شکل وصورت کیسا دھوکا دیتی ہے، کتنے ہندوستانی ایسے گورے چٹے ہوتے ہیں، کہ ولایتی معلوم ہوتے ہیں، اور بعض سونلے رنگ کے ایرانی بھی دیکھے ہیں، ہماری زبان کا ایک بہت ہی خوبصورت لفظ "چُلبلا" ہے، جو غزلگو شاعروں کے ہاں خوب خوب کام آتا ہے، اسکی شکل تو ہندی ہے، مگر ہے ایرانی برہان قاطع میں ہے،

"چُلبلہ بضم اول وبائے ابجد بر وزن سنبلہ شتاب واضطراب راگویند"،

ہم سمجھتے تھے کہ اس کا تعلق ہمارے ہندی لفظ "چھل بل" سے ہے، اب غور کرنا پڑے گا،

لفظ بھی کیا کیا صورت بدلتے ہیں، موٹے کپڑے کو ہم "گفش" کہتے ہیں، مگر یہ آیا کہاں سے فارسی میں اسکی صورت "گبز" ہے، (بفتح اول وسکون ثانی وزائے نقطہ دار، ہر چیز گندہ وقوی وسطبر را گویند" (برہان قاطع) اس کی دوسری شکل "غفص" کی ہے، صورت تو عربی ہے، مگر عربی نہیں،

"احدی" کے معنی ہماری زبان میں سست اور کاہل کے ہیں، مگر ان سُست کاہلوں کی پیدائش تاریخی ہے، اَحَدی، اَحَدی، ہی، اَحَد کے معنی عربی میں ایک ہیں، وہ سپاہی جو فوج سے الگ اکیلا ڈیوڑھی کی خدمت پر مامور رہتا تھا، اکبر نے اس کو احدی (اکیلا) کا لقب بخشا، یہ احدی کہلاتے تھے، اور ڈیوڑھی پر پڑے رہتے تھے، کوئی کام کاج ان سے متعلق نہ تھا، اسلئے زبانِ خلق ذراسکونِ سُست وکاہل کے معنوں میں کہکر پکارا، زبان خلق کو کون روک سکتا ہے،

ہماری زبان میں ایک لفظ "قلعی" ہے، آیئے اسکی بھی قلعی کھولیں، ہم لکھتے گو "قلعی" ہیں مگر بولتے "قلئی" ہیں، ہماری زبان میں اس کے معنی سپیدی اور صفائی کے ہیں، برتنوں پر قلعی کی جاتی ہے، اور مکانوں پر قلعی پھیری جاتی ہے،

یہ لفظ گو پرانی عربی کا نہیں، مگر پھر بھی عربی لغتوں میں ملتا ہے "قلعی" عربی میں (لسان) اور اس

سے فارسی میں (مؤیدالفضلاء) رانگے کو کہتے ہیں، مگر رانگے کو قلعی کیوں کہتے ہیں، لسان العرب کا بیان ہے، کہ قلع ایک کان کا نام ہے جس سے رانگے کی بہترین قسم نکلتی تھی، اسلئے اس کی طرف نسبت کرکے اچھے رانگے کو قلعی کہتے ہیں، اور چونکہ اسی رانگے سے تانبے کے برتنوں پر سپیدی کی جاتی ہے، اسلئے اس کو قلعی کرنا کہنے لگے، پھر چونے سے بھی اگر مکانوں پر سپیدی کی جائے تو اس کو بھی قلعی کرنا کہدیا، ہماری زبان میں ان استعمالوں سے یہ معنی پیدا ہوئے، کہ کسی داغ دھبے یا کسی کے عیب کو اگر چھپایا جائے، تو وہ اس پر قلعی کرنا ہوا، اور اگر اس داغ دھبے اور عیب کو ظاہر کرکے سب کو دکھایا جاتا ہے، تو وہ قلعی کھولنا ہوا،

تماشا بھی عجیب تماشے کا لفظ ہے، لفظ تو عربی ہے، لیکن معنی عجمی ہیں، یہ "مشی" سے بنا ہے، جس کے معنی چلنے کے ہیں، اس کو باب تفاعل میں لے گئے، تو تماشی ہوا، اور معنی باہم مل کر چلنا ہوئے عجمیوں نے تماشی کو اپنے قاعدہ سے تماشا بنالیا، جیسے تمنّی کو تمنا بنادیا، چونکہ سیر و تفریح کے لئے چند احباب ساتھ مل کر چلتے ہیں، اسلئے خود سیر و تفریح کو تماشا کہنے لگے، اس کے بعد آگے بڑھے تو سیر و تفریح کے سامان کا بھی تماشا نام رکھا،

بجرم عشق تو مارا اکشند غوغائیست
تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

ارمغانِ احباب

یعنی

دلّی اور اسکے اطراف

آج سے پینتالیس برس پہلے

از مولینا حکیم سید عبدالحیٔ صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء

(۵)

انبہٹہ

روز پنجشنبہ یازدہم شعبان، علی الصباح گاڑی آگئی، اور ہم لوگ حوائج ضروری سے فارغ ہوکر روانہ ہوئے تھا،(؟) سہارنپور تک ملا عنایت اللہ خاں صاحب تھانہ دار پنشنر و مولوی نظام الدین صاحب بطریق مشایعت کے ساتھ آئے، پھر ہم نے ان کو باصرار واپس کیا، تقریباً ایک بجے ہم انبہٹہ پہونچے، اور ترجماعت کیساتھ ظہر کی نماز ادا کی، اس کے بعد حضرت شاہ ابوالمعالیؒ کے درگاہ پر حاضر ہوکر فاتحہ پڑھا، پھر سوار ہوئے عصر کے وقت گنگوہ پہونچے،

گنگوہ

شہر سے باہر ایک محلہ ہے سرائے پیرزادگان اس میں حضرت مولینا رشید احمد صاحب کا دولتخانہ ہے، شہر مثل اور قصبوں کے نہایت پر رونق آباد ہے، بلکہ اس طرف کے جس قدر قصبے دیکھے گئے نہایت ہی آباد ہیں، اودھ کے اکثر شہروں سے زیادہ ان میں رونق ہے، اور اکثر قصبوں میں میونسپلٹی کا انتظام ہے، پانی پت اور دیوبند اور گنگوہ اس بارہ میں خاصکر ذکر کے قابل ہیں، بہرحال ہم سرائے پیرزادگان میں آئے، پہلے خانقاہ کے باہر ایک نشست کے مکان میں جو نہایت آراستہ تھا مولینا کے صاحبزادہ حکیم مسعود احمد صاحب ملے، ترکی ٹوپی اور قمیص پہنے ہوئے

بیٹھے تھے، ہیں سمجھا کوئی جنٹلمین ہیں، اونھوں نے فرمایا کہ خانقاہ تشریف لے چلئے مولینا وہیں ہیں، ہم خانقاہ آئے حضرت مولوی صاحب استنجا کر رہے تھے، فرمایا کہ کمرہ میں چلو، ہم گئے، تھوڑی ہی دیر کے بعد نکل کر مسجد آئے، نماز پڑھی، پھر کمرہ میں مولینا کی خدمت میں حاضر ہوئے بھائی جی مسجد ہی میں رہے،

مولینا شاہ رشید احمد صاحب گنگوہی

مجھ سے پوچھا کہاں سے آئے ہو، میں نے کہا رائے بریلی سے، پوچھا کیوں آئے ہو، میں نے کہا حضور کی زیارت کے واسطے، کہنے لگے، مطلب کہو بے مطلب کوئی کسی کی زیارت کرتا ہے، میں نے کہا مطلب کچھ بھی نہیں یہی مطلب ہے کہ ہم زیارت کو آئے ہیں، کہا دوسرے کون ہیں، میں نے کہا میرے بھائی ہیں، کہا بڑے بھائی ہیں، میں نے کہا پھوپھی زاد بھائی، میں نے کہا مولوی ابوالقاسم صاحب[۱] نے آپ کو سلام عرض کیا ہے، کہا مولوی صاحب اچھے ہیں، میں نے کہا جی ہاں، پوچھا کہ وہ رائے بریلی گئے ہیں، میں نے کہا ارادہ تو تھا، مگر میرے سامنے تک نہیں گئے تھے، کہا وہ تمہارے کون ہیں، میں نے کہا بھائی، کہا سگے بھائی ہیں، میں نے کہا ماموں زاد، کہا سگے ماموں زاد، میں نے کہا جی ہاں، کہا کہ انکی کیا عمر ہے، میں نے کہا پینتیس چھتیس برس کی، کہا ابھی نوعمر ہیں، اس کے بعد میں نے کہا شیخ عبدالخالق صاحب[۲] نے آپ کو سلام کہا ہے، کہا شیخ صاحب اچھے ہیں، میں نے کہا جی ہاں، میں نے کہا کہ مولوی عبدالحکیم(؟) صاحب و مولوی رحمت علی صاحب وغیرہ نے بھی سلام عرض کیا ہے، کہا سب اچھے ہیں، میں نے کہا سب اچھے ہیں، اس کے بعد میں نے کہا کہ میں مسلسل بالاولیہ سننا چاہتا ہوں، کہنے لگے، کہ اسکی سند خود مجھ کو نہیں ہے، شاہ صاحب کے یہاں جاکر سبق میں شریک ہوگیا تھا، نہ مسلسل بالاولیہ کی سند ہے، نہ مسلسل بالتمر و مسلسل بالمصافحہ کی، تبرک کے واسطے لوگ سند لے لیتے ہیں، اور نہ یہ گڑیو(؟)

[۱] ہنسوی [۲] مولینا عارف ہنسوی کے والد بزرگوار مرحوم،

کا کھلونا ہے، مجھ کو کبھی ان کا خیال نہیں ہوا، اصل مقصود کی طرف توجہ رہے، اصل مقصود یہ ہے
کہ اشکال حدیث کا حل کیا جائے، تعارض دفع کیا جائے، مسئلہ ثابت کیا جائے، تفقہ حاصل ہو،
اسی کی طرف میرا خیال رہا، حنفی شافعی جو ہوں اپنا مسئلہ ثابت کریں، مولوی عبدالقیوم صاحب کی
زیارت ہوئی، سوان سے بھی میں نے نہیں عرض کیا ایک استاد نے میرے کسی کو اجازت دی تھی،
مجھ کو بھی بلایا، میں نے ان سے عذر کر دیا کہ مجھ کو اس سے کیا حاصل، جو بکار آمد چیز ہے، وہ حاصل
ہونی چاہئے، اگر تم کہو تو جیسی کچھ ناقص ہے سنا دوں، میں نے کچھ جواب نہیں دیا، اسکے بعد
کہا تم نے کس سے کس سے پڑھا ہے، میں نے سب حال بیان کیا، اس کے بعد کہا کہ اب آرام کرو،
تھکے ماندہ ہو، میں اٹھکر باہر آیا،

مولوی صاحب بہت ضعیف و نحیف ہیں، عمر کی حیثیت سے یہ ضعف نہیں ملتا، کیونکہ عمر
غالباً ساٹھ سے کچھ ہی متجاوز ہوگی، بڑھاپے کے ایسے آثار نمودار نہیں ہیں، بلکہ بیماری کا ضعف
ہے، چہرہ سے نحافت معلوم ہوتی ہے، قد بالا، اور گورے چٹے آدمی ہیں، داڑھی بھری ہوئی
لانبی کھچڑی بال، مزاج میں کسی قدر تند معلوم ہوتے ہیں، یا شاید بیماری کی وجہ سے ہو گئے ہوں،
وقار و ہیبت غالب ہے، سکوت و وقار کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں، کسی کو زیادہ مجال گفتگو
کی نہیں ہے، سب چپ چاپ ہر وقت سامنے بیٹھے رہتے ہیں، بیماری کی وجہ سے مسجد نہیں آسکتے تھے، مرض
نے پھر اعادہ کیا تھا، کل سے مسجد تشریف لیجاتے ہیں، نماز پنجوقتہ خود ہی پڑھاتے ہیں، قرأت سے
معلوم ہوتا ہے کہ تجوید و قرأت میں دخل رکھتے ہیں، بہت صاف اور سیدھی آواز میں پانی پت کے
لہجہ میں پڑھتے ہیں، مغرب اور عشا کی نماز حسب معمول خود پڑھائی، جس وقت وہ تشریف لاتے
ہیں، اسی وقت تکبیر ہوتی ہے، لوگ پہلے سے منتظر رہتے ہیں، مولوی صاحب کے لباس
و مکان میں بہت تجمل ہے، سب چیزیں آراستہ قرینہ سے رکھی ہوئی ہیں، دو دو دیوار گھڑی قالین

کی جانماز اوس پر اونی چوتھی چوپرت بچھی ہوئی، چھوٹے چھوٹے تکیہ رکھے ہوئے ایک عمدہ پلنگڑی،
اس پر گدہ، گدہ پر سفید چاندنی و دولائی نہایت عمدہ، الماری میں قرینہ سے کتابیں چنی ہوئیں طبائی
کا کمرہ میں فرش نہایت صاف شفاف، بہرحال نہایت تجمل کیساتھ، مگر سادگی کے انداز میں رہتے
ہیں، اوسی کمرہ کے سامنے جو حجرہ ہے، اس میں میرے رہنے کا حکم ہوا،

بروز جمعہ دوازدہم شعبان۔ صبح کو اٹھکر حوائج ضروری سے فارغ ہو کر خاکسار مولوی صاحب
کی خدمت میں گیا، مولوی صاحب اندر کے کمرے میں پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے، ایک صاحب
اور بیٹھے تھے، کچھ لوگ باہر کے کمرہ میں ادب سے سر جھکائے ہوئے بیٹھے تھے، میں بھی باہر ہی بیٹھنے لگا
آواز دیکر کہا اندر آجاؤ، میں اور بھائی جی اندر گئے، فرمایا معاف کرنا، معذور ہوں، میں نے کہا آپ
آرام سے لیٹے رہئے، یہ کہکر فرش پر میں بیٹھ گیا، مجھ سے فرمایا کہ کل مسلسل کے نسبت آپ نے کہا
تھا، خیر جیسی ہے، ناقص ہے یا کامل سنائے دیتا ہوں، الرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ
فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ اسکی سند یہ ہے کہ میں نے مولوی محمد قاسم صاحب سے سنا ہیں
جب شاہ صاحب کی خدمت میں گیا، تو پہلے سے وہ ان کے یہاں پڑھتے تھے، مجھ کو یاد نہیں کہ پہلے
بھی ان سے حدیث کا مذاکرہ مجھ سے ہوا ہے، یا نہیں، اونھوں نے شاہ عبدالغنی صاحب سے سنا
اور شاہ صاحب نے مولینا محمد اسحاق صاحب سے اور مولینا محمد اسحق صاحب نے شاہ عبدالعزیز صاحب
سے اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے شاہ ولی اللہ صاحب سے، اور ان کی سند سب کہیں مشہور ہے،

اوسکے بعد مجھ سے کچھ بھوپال کا حال پوچھتے رہے، پھر فرمایا کہ بھوپال سے کب آئے ہیں،
میں نے کہا چار پانچ مہینے ہوئے، فرمایا، کچھ درس تدریس ہوتی ہے، میں نے کہا اب تک اتفاق نہیں ہوا
لیکن اب ارادہ ہے، فرمایا کہ رائے بریلی میں طلبہ ہیں، میں نے کہا نہیں، وہ چھوٹا شہر ہے، لکھنؤ میں
ہیں، فرمایا کہ لکھنؤ بیس کوس ہے، دو گھنٹہ کا راستہ ہے، اور ریل بھی ہے، پھر میں نے کہا کہ

راے بریلی ایک چھوٹا شہر ہے، اور غریب خانہ خاص شہر میں بھی نہیں ہے، بلکہ ایک مقام ہے تکیہ ایک میل کے فاصلہ پر اس میں ہے، کہنے لگے، آپ تکیہ کے رہنے والے ہیں، میں نے عرض کیا جی ہاں کہنے لگے وہ ایک محلہ ہے، میں نے کہا سوادِ شہر میں ہے، محلہ کے طور پر نہیں ہے، کہنے لگے بڑی بستی ہے میں نے کہا نہیں، ہمیں لوگوں کے کچھ مکانات ہیں، کہنے لگے پچاس ساٹھ آدمی ہوں گے میں نے کہا کل برادری غالبًا اتنی ہو گی، لیکن اب جو تکیہ پر رہتے ہیں، وہ دس بارہ سے زیادہ نہ ہونگے کہنے لگے ایک صاحب پہلے آئے تھے میاں عرفان حضرت سید صاحب کے بھائی کے نواسے ہیں، میں نے عرض کیا وہ سید صاحب کے نواسہ ہیں، اور ان کے بھائی کے پوتے، فرمایا کہ حضرت کے اولاد صلبی بھی ہے، میں نے کہا جی ہاں دو صاحبزادیاں تھیں، بڑی صاحبزادی کے جو بیٹے تھے، وہ میرے پھوپھا تھے، ان کا انتقال ہو گیا، دوسری صاحبزادی کے تین بیٹے ہیں، مولوی عرفان صاحب اور ان کے بھائی، اسی طور پر کچھ دیر خاندان کے نسبت کچھ باتیں کرتے رہے، پھر اٹھکر گھر تشریف لے گئے تھوڑی دیر کے بعد پھر تشریف لائے کھانا آیا، ہم سب نے کھانا کھایا، پھر نماز کی تیاریاں ہوئیں، مسجد گئے مولوی صاحب کے صاحبزادے بھی آئے، ایک صوف کا سیاہ چوغہ اور ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھے، پھر مولوی صاحب تشریف لائے، ایک شامی سیاہ عمامہ باندھے ہوئے اور دوہری انگرکھے کے اوپر ایک فاختئی رنگ کا بانات کا کوٹ پہنے ہوئے، جس کے اطراف طلائی لیس دو انگل کی ٹکی ہوئی، اور لیس کے اوپر انگریزی کلابتو کا نہایت عمدہ کام اور آستینوں میں ترنج بنے ہوئے جب مسجد آئے تو لوگ کھڑے ہونے لگے، فرمایا بیٹھے رہو، اگر اول صف میں ایک جگہ جانماز پر جو تہی بچھی ہوئی تھی بیٹھ گئے، سنت پڑھ کر خود ہی خطبہ پڑھا، مولینا محمد اسمٰعیل کا جمع کیا ہوا، اوس کے بعد وہی جوتہی بیچ امام کے مصلے پہ بچھا دی گئی، اوس پر نماز پڑھائی اوس کے بعد سنتیں پڑھکر کمرہ میں آئے، باہر کے کمرہ میں چارپائی بچھا دی گئی تھی، اوس پر لیٹ گئے، اور ملنے والے اس کے گرد و پیش بیٹھ گئے، ہم بھی جا کر

بیٹھے، لوگ اپنی اپنی عرض معروض کرتے رہے، وہ لیٹے ہوئے تسبیح پڑھتے جاتے تھے، بھائی جی نے بیعت کی استدعا کی سلسلہ احمدیہ میں، فرمایا، شاہ عبد الخالق صاحب آپ کے قریب میں، ان سے بیعت کیجئے، وہ سلسلہ احمدیہ میں بیعت لیں گے، میں سلسلہ چشتیہ میں بیعت لیتا ہوں، اور میرے یہاں کچھ ہے نہیں، آپ کو کچھ فائدہ نہ ہو گا، بھائی جی نے کہا میں دخولِ سلسلہ چاہتا ہوں، فرمایا کہ لوگ بیعت کرنے کے بعد پھر کچھ اور آرزو کرتے ہیں، تو مجھ کو شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے، شاہ عبد الخالق صاحب شاہ احمد سعید صاحب کے سلسلۂ احمدیہ میں ہیں، ان سے بیعت کیجئے، بھائی جی نے کہا میں سلسلۂ احمدیہ میں حضرت سید صاحب کے سلسلہ میں شریک ہونا چاہتا ہوں، فرمایا کہ البتہ ان کے سلسلہ میں میں داخل کر سکتا ہوں، ہمارے بڑے میاں صاحب سید صاحب کے مرید تھے، اس کا میں ذمہ دار ہوں، کہ اس سلسلہ میں آپ داخل ہو جائیں گے، لیکن اور کچھ فائدہ نہ ہو گا، میرا کام پڑھنا پڑھانا ہے، اگر آپ کو صرف دخولِ سلسلہ مقصود ہو تو بہتر ہے، بعد نمازِ عصر کے لیکن استخارہ کر لیجئے، بھائی جی نے کہا میں استخارہ کر چکا ہوں، فرمایا کہ پھر دو رکعت نماز پڑھکر دعاے استخارہ پڑھئے، اسکے بعد میں اٹھ آیا، عصر کے بعد پھر حاضر ہوا، خود بدولت اندر کے کمرہ میں تھے، میں اور بھائی جی باہر کے کمرہ میں بیٹھو دیکھ کر بھائی جی کو اشارہ کیا، آئیے، وہ اندر گئے، اور مجھ سے کہا آپ وہیں بیٹھے میں بیٹھا رہا، لیکن بسبب قرب گفتگو سب سنتا جاتا تھا پہلے بیعت کے مسئلہ پر گفتگو کی، اس کے اقسام اور احکام کا نہایت تفصیل کیساتھ بیان کیا، اور غرض وغایت اسکی بیان کی، پھر خانوادوں کا ذکر کیا، ان کے اختلاف کا بیان کیا، پھر خطبہ مسنونہ پڑھکر بیعت مسنونہ لی اور توبہ کرائی، اسکے بعد ذکر تلقین کیا، جب سب مراتب طے ہو گئے، تو مجھ کو بلایا، میں اندر گیا تو فرمایا کہ سب مشائخ طبیب امت ہیں، اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں کے اعتبار سے طرق اونھوں نے رکھے ہیں، سب کا مآل ایک ہے، اور سب کا خلاصہ اتباعِ سنت ہے، بعد کے لوگوں نے بدعتیں داخل کر دی تھیں، ان کے مجدد حضرت سید صاحب

ہوئے، جس سے جس کو عقیدت ہو، اسکے طریقہ میں وہ داخل ہو جائے فائدہ ہوگا، پھر فرمایا کہ مجھکو حضرت سید صاحب کے ساتھ محبت و عقیدت اعلیٰ درجہ کی ہے، میں یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے پیر شاہ عبد العزیز صاحب سے بڑھ کر ہیں، باقی خدا جانے کون بڑھکر ہے، لیکن میرے دل میں ہمیشہ یہی آتا ہے، میں اپنے قلب کا مختار نہیں ہوں، یہ کچھ خدا کی طرف سے ہے، پھر میں کہتا ہوں، اللہ تو ہی جانے میں مجبور ہوں، شاہ صاحب کے پہلے سے اس خاندان میں اتباع سنت تھا، مگر حضرت نے نہایت درجہ کو اتباع کیا، ہندوستان میں نور پھیلا دیا، علما، کہتے ہیں کہ وہی کتابیں پہلے تھیں، وہی اب بھی ہیں، لیکن اب خدا جانے کیا بات ہو گئی ہے، جو ان کی صحبت میں ایک گھڑی بیٹھا، اس میں وہی رنگ آگیا، جس میں زیادہ اتباع سنت ہو وہی ولی کامل ہے، میرا تو عقیدہ یہی ہے، کہ سید صاحب اپنے پیر سے بڑھکر ہیں، ان کے دیکھنے والوں میں سے بہت کم لوگوں سے ملا ہوں، لیکن انبیٹھہ میں ایک حاجی صاحب تھے، تھے تو کم استعداد، لیکن ان کی عجب حالت تھی، ان کی صحبت میں بہت رہا ہوں، میرے دادا پیر میانجی نور محمد صاحب حضرت کے مرید تھے، اور ان کے پیر حضرت حاجی عبد الرحیم صاحب بھی سید صاحب کے مرید تھے یہ دو طریقے حضرت کے سلسلہ کے ہیں، مجھ کو سب سے زیادہ حضرت سے محبت و عقیدت ہے، میں اپنے قلب سے مجبور ہوں، یہ اللہ ہی کی طرف سے کوئی بات ہے، اس کے بعد اور لوگ آ گئے، اور اپنی اپنی عرض و معروض کرنے لگے، ہم اٹھ آئے،

مولوی مسعود احمد صاحب

وہاں سے اٹھ کر مولوی مسعود احمد صاحب سے ملنے گئے، انھوں نے نہایت اعزاز و اکرام سے بٹھایا، حالات پوچھتے رہے، فرمایا کہ مولوی ابو القاسم صاحب سے آپ سے کیا قرابت ہے، کل حضرت نے بعد مغرب مجھ سے فرمایا تھا، کہ مولوی ابو القاسم صاحب کے بھائی آئے ہیں، اسکے بعد بھائی جی نے کچھ اپنی علالتوں کا حال بیان کیا، یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہوئی، سب اوٹھ گئے،

معمولات

مغرب کی نماز کے بعد پھر مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ اندر کے کمرہ میں تھے، کچھ لوگ باہر بیٹھے تھے، وہیں بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد کھانا آیا، کھانا کھا کر قیام گاہ پر واپس آیا، یہاں تک کہ عشا کی اذان ہوئی، نماز کے واسطے مسجد گیا، نماز کے بعد پھر واپس آیا، مولوی صاحب بھی نماز پڑھا کر چلے آئے، اب اندر کمرہ گئے ہیں، مولوی صاحب کے اوقات جن کے ہمیشہ وہ پابند ہیں یہ ہیں، کہ بعد نماز صبح کے حجرہ میں چلے جاتے ہیں، اشراق کے بعد خطوط ملاحظہ فرماتے ہیں، خطوط کے دو حصے کئے جاتے ہیں، ایک وہ جو احباب کے ہیں جن میں خیر و عافیت ہوتی ہے، یا خیریت دریافت کیجاتی ہے، ان کے جواب اسی وقت تحریر فرماتے ہیں، آٹھ بجے کے بعد درس شروع ہوتا ہے، ۱۱ بجے تک اس میں مصروف رہتے ہیں، اس کے بعد کھانا تناول کر کے قیلولہ کرتے ہیں، پھر ظہر کی نماز پڑھتے ہیں، نماز کے بعد خطوط کا دوسرا حصہ یعنی وہ خطوط جو بطور استفتا کے ہوتے ہیں ملاحظہ فرماتے ہیں، اور ان کے جوابات لکھتے ہیں، دو بجے تک، دو بجے کے بعد پھر درس شروع ہوتا ہے، اس میں چار بجے تک مصروف رہتے ہیں، چار بجے عصر کی نماز پڑھتے ہیں، پھر باہر نشست فرماتے ہیں، اور عام طور پر لوگوں سے ملتے ہیں، جس کو جو کہنا سننا ہوتا ہے وہ کہتا ہے، اور خود بدولت سنتے ہیں، مغرب تک مغرب کی نماز کے بعد پھر اندر بیٹھتے ہیں، خاص خاص لوگ اس وقت بھی حاضر ہو سکتے ہیں، مولوی صاحب کا یہ بھی دستور ہے، کہ اوقات درس میں کسی سے گفتگو نہیں فرماتے اب آج کل بیماری کی وجہ سے درس موقوف ہے، اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب بقیۃ السلف ہیں، ان کا وجود مغتنمات میں سے ہے، اس تورع و استقامت کا دوسرا شیخ ان کے سوا اس زمانہ عالم آشوب میں نظر نہیں آتا، علم الٰہی میں جو کوئی ہو، اسکی خبر نہیں، مولوی صاحب کے اوصاف میں سب سے بڑا وصف تورع ہے، جو تمام اوصاف کو شامل ہے، کف لسان اور صدق گفتار میں مولوی صاحب ضرب المثل ہیں، اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے صدقہ میں اس روسیاہ

کے حال پر رحم فرمائے، اس کے دل کی تاریکی دور ہو، اور کسی قدر چاشنی احسان کی عطا فرمائی جائے،

الٰھی عبدک العاصی اتاکا — مقراً بالذنوب وقد دعاکا

ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین،

شاہا ز کرم بر من درویش نگر — بر حال من خستہ و دلریش نگر

ہر چند نیم لایق بخشایش تو — بر من منگر بر کرم خویش نگر

روز یکشنبہ سیزدہم شعبان، آج بہت سویرے آنکھ کھلی، کیواڑے کھول کر جو دیکھا، تو ابھی بہت رات باقی تھی، اور پڑھنے کی آواز آرہی تھی، خیال جو کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت تلاوت فرما رہے ہیں یا تہجد میں قرآن پڑھتے ہوں، یہ قاصر الہمت پھر آکر لیٹ رہا، کچھ دیر کے بعد اذان ہوئی، اٹھکر پاخانہ گیا، وہاں سے آکر وضو کرکے جماعت میں شریک ہوا، بعد نماز کے حضرت مولوی صاحب کے کمرہ میں گیا، وہ اندر تھے کچھ لوگ باہر تھے، یہ روسیاہ باہر ہی بیٹھ گیا، اور اپنی شامت اعمال اور خبث باطنی کے انجام کی فکر کرنے لگا، افسوس وصد ہزار افسوس عمر طبعی کا ایک ربع اس بطالت اور بیہودگی میں گذرا، کہ باوجود مسلمانوں کے بدنام کرنے کے اب تک ایمان خالص اور اسلام کامل کا ایک حصہ بھی نصیب نہیں ہوا، بوالہوسی حد سے زیادہ ہے، اور کام کچھ ہو نہیں سکتا، حب جاہ و پراگندگی باطن ہر وقت مستولی رہتی ہے، دیکھئے انجام کیا ہو، ع:

سالیکہ نکوست از بہارش پیداست

جس کی ابتدا بگڑ گئی ہو، اس کے انجام کا خدا حافظ ہے، یہ بھی ایک شامت ہے، کہ ان بزرگون کی خدمت میں پہونچکر اپنی بے استعدادی کی وجہ سے فیض سے محروم رہے، ع

زمین شور سنبل بر نیارد،

جب قلب میں صلاحیت ہی نہ ہو تو کیا تاثیر ہو سکتی ہے، یہ بھی ایک شامت ہے، کہ ان بزرگوں کی خدمت

میں پہونچکر پھر صحبت سے محروم رہ جائے، اے اللہ، اے ہادی، اے مرشد، تو ہی اس بے بہرہ کی دستگیری فرما، اللھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا راد لما قضیت استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ،

سید صاحب کی صحبت کا اثرات

تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولینا سلمہ اللہ تعالیٰ برآمد ہوئے، اور گھر تشریف لے گئے، بھائی جی کا ارادہ آج ہی روانگی کا ہے، اور یہ روسیاہ بھی اون کی رفاقت میں آج ہی جانے والا ہے، اس وجہ سے بڑھ کر عرض کیا کہ میں رخصت ہونا چاہتا ہوں، فرمایا کھانا کھا کر جانا، پھر دوبارہ عرض کرنا داخل گستاخی سمجھکر چپ ہو گیا، اس کے بعد بعض بزرگ وہیں بیٹھ گئے، یہ خاکسار بھی بیٹھ گیا، سید صاحب کے فضائل و خصائص بیان کرنے لگے، ان میں سے ایک نے کہا کہ سب فضیلتیں ایک طرف اور یہ فضیلت ایک طرف ہے، کہ سید صاحب کے مریدوں میں ان کا رنگ ایسا جم جاتا تھا کہ کسی طرح اس میں تغیر نہیں آتا تھا، بلا کی تاثیر تھی، ایک مرتبہ جس نے ان کی صحبت حاصل کرلی وہ پھر انہی کا دم بھرنے لگتا تھا، مرد تو مرد عورتیں تک جنھوں نے سوا ایک بار کے کبھی ان کی زیارت نہیں کی، وہ ایسی پختہ ہو جاتی تھیں، کہ پھر کسی طرح اپنے خیالات سے نہیں ہٹتی تھیں، وہ کہتے تھے کہ میری والدہ سید صاحب کی مرید تھیں، لیکن اس طور پر کہ نانوتہ جب سید صاحب تشریف لے گئے اور عورتوں نے مرید ہونا چاہا، تو ایک مکان میں وہ سب جمع کر دی گئیں، سید صاحب تشریف لائے دروازے سے پگڑی پھینک دی، سبھوں نے اس کو پکڑ لیا، اور توبہ کرلی، ان عورتوں پر اچھی طرح وعظ و پند کا اثر نہیں پڑ سکا، لیکن باوجود اس کے میری والدہ عقائد صحیحہ پر ایسی پختہ تھیں، کہ ان پر کسی کا جادو نہ چل سکا، پیرزادوں میں ان کی شادی ہوئی، اور گنگوہ کے پیرزادے نہایت سخت وہ سب ایک طرف، بلکہ والد ایک طرف، اور وہ ایک طرف، لیکن اگر اثر پڑا ہے، تو ان ہی کا دوسروں پر پڑا ہے، ان پر کسی کا اثر نہیں پڑا، یہ بھی بیان کیا کہ جب سید صاحب کاندھلہ تشریف لے گئے، تو

اس وقت مولوی ابوالحسن صاحب سن رسیدہ تھے، ان کے صاجزادہ مولوی نورالحسن آٹھ دس برس کے تھے، اور زیور پہنے ہوئے تھے، جب سید صاحب تشریف لائے، تو صاجزادہ صاحب آکر بیٹھ گئے، سید صاحب نے فرمایا مولینا یہ کون ہیں، انھوں نے کہا بندہ زادہ فرمایا یہ کیا پہنے ہوئے ہیں، کیا یہ جائز ہے، کچھ ایسی تقریر فرمائی، کہ وہ شرمندہ ہوئے، اور اسی وقت انھوں نے اس کو اتروا ڈالا، عورتوں نے بہت دند مچایا، کہ یہ نئے مولوی کہاں سے آئے ہیں، ہمارے مولویوں نے کبھی نہیں منع کیا، اب نئی کتابیں بنی ہیں، جو پہلے تھیں وہی اب بھی ہیں، مولوی صاحب نے فرمایا، کہ واقعی کتابیں تو وہی ہیں، جو پہلے تھیں، لیکن ہم نہیں جانتے، کہ ہم کو کیا ہوگیا تھا، اس قسم کے اور بھی قصص بیان کرتے رہے،

اس کے بعد مولوی رشید احمد صاحب کا ذکر سب نے بیان کیا، کہ اسی شدتِ مرض کی حالت میں بھی مولینا نے کبھی رخصت پر عمل نہیں کیا، مرض کی یہ حالت تھی کہ ذرا سی نقل و حرکت میں دست آجاتا تھا، کسی نے پیر چھوا، اور حاجت ہوئی، کھڑے ہوئے اور دست آیا، دن بھر میں ستر ستر دست آتے تھے، مگر باوجود اس کے کبھی چارپائی یا کپڑے میں نہیں کیا، ہمیشہ چوکی پر تشریف لیجاتے تھے، حالانکہ اوٹھ بیٹھ نہیں سکتے تھے، لوگوں نے ہر چند سمجھایا، مگر نہیں مانا، دوسرے کبھی بیٹھ کر نماز نہیں پڑھی، فرض ہمیشہ کھڑے ہوکر پڑھتے تھے، جب لوگ زیادہ سمجھاتے تھے، تو کہتے تھے، کہ جب تک کھڑا ہوا جاتا ہے، بیٹھکر نہ پڑھوں گا، چاہے گر ہی کیوں نہ پڑوں مرض سے ادھر افاقہ ہوا، اور مسجد جانے لگے، تھوڑی دیر کے بعد مولینا گھر سے تشریف لائے، ہم لوگ جاکر پاس بیٹھے، نو بجے تک بیٹھے رہے، نو بجے کے بعد کھانا آیا، فرمایا کہ کھانا کھالو، کھانا کھاکر رخصت ہوئے،

سہارنپور — مغرب کے بعد سہارنپور پہونچے، یہاں کے حساب سے سہارنپور اٹھارہ کوس ہے

لیکن ہمارے یہاں کے کوسوں سے دس کوس یہاں کے اور وہاں کے کوسوں میں ڈیوڑھے کا فرق ہے، یہاں آئے، تو پہلے سے ملا عنایت اللہ صاحب نے کھانا تیار کر رکھا تھا اثناءِ طعام میں ان سے معلوم ہوا کہ ایک صاحب یہاں ہیں، جنھوں نے حال میں سید صاحب سے بعیت کی ہے میں نے ان کا نام بہت پوچھا، مگر ملا صاحب نے کہا میں یہ بتا نہیں سکتا،

روز یکشنبہ چہار دہم شعبان صبح کو اٹھکر میں نے مولوی نظام الدین سے اپنی آمد کی اطلاع کرائی، تھوڑی ہی دیر میں وہ اور حاجی فدا حسین صاحب ملنے کو آئے، آخر الذکر مولینا ولایت علی صاحب عظیم آبادی کے مرید ہیں، مولوی نظام الدین سے معلوم ہوا کہ خط کا جواب ابھی نہیں آیا، لیکن تحقیق معلوم ہوا، کہ مولوی محمد حسین صاحب نگینہ میں ہیں، مجھ کو طولِ مسافت پر نہایت ہی افسوس ہوا، اور نیز اس وجہ سے کہ خرچ بھی چک گیا ہے، مگر چونکہ یہ سفر خاص مردانِ خدا کی تلاش میں کیا گیا ہے، اس واسطے ضرور ہے، کہ اون سے بھی ملاقات کیجائے، خداوند عالم کارساز ہے اس واسطے مصمم ارادہ ہے کہ ایک دو روز کے واسطے نگینہ چلا جاؤں، بھائی جی کو بھی آج مفارقت ہوئی، وہ آگرہ گئے، آگرہ سے گوالیار، اور وہاں سے اٹاوہ، اور وہاں سے ہنسوہ جائیں گے،

دس بجے مولینا احمد علی صاحب ملنے کو تشریف لائے، یہ بزرگ حضرت سید نارو حی فداہ کے بڑے ارادتمندوں میں ہیں، ان سے مل کر بہت طبیعت خوش ہوئی، بڑے صالح، اور بے تکلف ہیں، اس روسیاہ کے حال پر بڑی نوازش فرمائی،

بارہ بجے نگینہ کے ارادہ سے اسٹیشن آیا، اور مشایعت میں مولوی نظام الدین صاحب بھی آئے، معلوم ہوا کہ دو بجے گاڑی جائے گی، اسلئے اسٹیشن سے مولوی نظام الدین صاحب کو میں نے رخصت کیا، اور میں نے مسجد پر جاکر ظہر کی نماز پڑھی، اور دو خط لکھکر ہنسوہ اور رائے بریلی

روانہ کئے، اس کے بعد ٹکٹ لیا، نگینہ تک کرایہ ہوا، جس وقت گاڑی پر سوار ہونے کو چلا، تو ایک صاحب گاڑی پر بیٹھے تھے، انھون نے آواز دی کہ یہان آکر بیٹھئے، میں نے دیکھا تو معلوم ہوا، کہ کوئی طالب العلم ہیں، اس رفاقت سے میری طبیعت بہت محظوظ ہوئی، وہیں جاکر بیٹھا، اور راستہ نہایت لطف کیساتھ کٹا، یہ مدرسہ دیوبند میں پڑھتے ہیں، اس مرتبہ صحاح ختم کرکے جاتے ہیں، نام ان کا مولوی مشیت اللہ برم پور کے سواد میں رہتے ہیں، ان سے بھی میں نے دیوبند کی کیفیت پوچھی،

دیوبند کے مدرسین

پہلا میرا سوال یہ تھا، کہ اب اساتذہ میں کون کون کس کس استعداد کے ہیں، اور کتابیں کیسی پڑھاتے ہیں، اس کے جواب میں انھون نے کہا کہ سب میرے استاد ہیں، اور آدمی اپنے استاد کی تعریف کرتا ہی ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ سارے مدرسہ میں ایک مولوی محمود حسن[1] صاحب تو ایسے ہیں، کہ سب کتابیں اچھی طرح پڑھا سکتے ہیں، خصوصًا دینیات میں تو ان کا ایسا پایۂ عالی ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں کم لوگ ہونگے باقی مدرسین براے نام ہیں، مجبوراً طلبہ اُن کے سامنے کتاب کھولتے ہیں، میں نے پھر خاصۃً مولوی خلیل احمد صاحب[2] کے نسبت سوال کیا، انھون نے کہا میں کیا کہوں، وہ کیسے ہیں، بڑے متقی بڑے زاہد ہیں، میں نے کہا یہ سب سہی پڑھانے میں کیسے ہیں، انھوں نے کہا کہ میں نے کہدیا، کہ مولوی محمود حسن صاحب کے سوا وہان اس کام کا کوئی نہیں تاہم مولوی خلیل احمد ہوں، یا حافظ احمد[3] دینیات پڑھا لیتے ہیں معقولات سے بالکل واسطہ نہیں، مولوی غلام رسول ولایتی معقولات پڑھاتے ہیں، لیکن اجنبیت زبان کی وجہ سے طلبہ کو معتدبہ فائدہ نہیں ہوتا، میرے خیال میں معقولات اس مدرسہ میں پڑھنا بےکار ہے اکثر یہی ہوتا ہے کہ دوبارہ پڑھنی پڑتی ہے، میں نے کہا علم ادب میں کسی کو مہارت ہے، کہنے

[1] شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، [2] مولینا خلیل احمد صاحب مرحوم سہارنپوری، [3] مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم ابن مولینا قاسم رحمۃ اللہ علیہ۔

لگے، مدرسہ سے باہر مولینا ذوالفقار علی صاحب بڑے ماہر ادیب ہیں، اور مولوی حبیب[1] الرحمن صاحب کو بھی بہت شوق ہے، وہ اکثر خارج از مدرسہ ادب ہی پڑھایا کرتے ہیں، اور مدرسین میں جو کچھ ہیں مولوی محمود حسن صاحب ہیں، محدث ہیں، تو وہ ہیں، فقیہ ہیں، تو وہ ہیں، بہرحال اب آج مدرسہ کی کائنات وہی ہیں،

مدرسہ دیوبند کے بعض اختلافات

دوسرا میرا سوال یہ تھا کہ مدرسہ کے بارہ میں نزاع اہل شہر کی کیا وجہ ہے، انھون نے کہا کہ اسکی وجہ بجاے خود لوگوں نے جو کچھ خیال کی ہو، مگر اصل یہ ہو کہ حاجی محمد عابد صاحب کی راے یہ ہے کہ مدرسہ کی حالت درست کیجائے، دس بارہ مدرس جو اسوقت ہیں، ان سب کو چھانٹ کر دو تین لائق فائق مدرس بلاکر رکھے جائیں، جتنا بار مدرسہ پر ان لوگوں کی تنخواہوں کا ہے، اس میں دو بڑے لائق فائق مدرس مل سکتے ہیں، اور مولوی محمود حسن صاحب بجائے خود رہیں، لیکن مولوی محمود حسن کہتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی موقوف کیا گیا، تو پہلے میرا استعفا ہے، گو حاجی محمد عابد صاحب ارباب شوری میں داخل ہیں، مگر ایک نہیں چلتی، اس واسطے اہل شہر نے در پردہ منشی فضل حق کی شورش مچا رکھی ہے، بلکہ طالب علمون میں خود شورش ہو رہی ہے، اسی امتحان میں دو طالب العلم مدرسہ سے نکالے گئے ہیں، ایک اس جرم میں کہ اس نے کچھ گستاخی کی تھی، مہتمم جس وقت پرچوں کی نگرانی کے واسطے اس کی طرف کئی بار آئے گئے، تو اس نے کہا امتحان کے وقت تو یہ نگرانی کرتے ہو، پڑھاتے وقت کبھی نگرانی کو نہیں آئے، کہ مدرسین کیسا پڑھا رہے ہیں، دوسرے نے پرچۂ امتحان میں بڑی بیہودہ گوئی کی تھی، بہرحال اس قسم کی شورشیں ہیں، حالانکہ اب جو بناے فساد قرار دی گئی ہے یعنی منشی فضل حق کی حمایت وہ بڑی پوچ اور لچر ہے، منشی فضل حق مہتمم سابق نہایت خائن تھا، ایک

[1] مولینا حبیب الرحمن صاحب ابن مولینا احمد علی صاحب مرحوم محدث سہارنپوری،

باون روپیہ کئی آنے اوس کے نیچے دبے ہوئے ہیں، مگر ع

حیلہ جو را بہانہ بسیار

شورش تو پہلے ہی سے تھی قابو کے منتظر تھے، موقع بھی ہاتھ آگیا،

قاضی محمد اسمٰعیل صاحب لندھورہ کے اسٹیشن پر جب ہم پہونچے، تو انھوں نے کہا کہ منگلور یہاں سے تین میل ہے، وہاں قاضی محمد اسمٰعیل صاحب بہت بڑے درویش گذرے ہیں، دو چار ان کی کرامتیں بھی بیان کیں، میں نے کہا کہ ان کے صاحبزادے کی کیا کیفیت ہے، انھوں نے کہا کہ اپنے والد کے زمانہ میں نہایت خراب حالت میں تھے، بڑے شوقین تھے، ان کے والد ہمیشہ انسے ناخوش رہتے تھے، لوگوں نے انتقال کے وقت خلافت کے بارہ میں کہا بھی، کہ کس کو آپ خلیفہ کرتے ہیں، اس کے جواب میں کہا کہ جس کو اللہ چاہے گا، وہ خود ہو رہے گا، ان کے انتقال فرماتے ہی ان کا ایسا رنگ بدل گیا، کہ ایسا بدلتے کہیں نہیں دیکھا، اب بڑے اچھے اوقات ہیں، ریاضات شاقہ کرتے ہیں قلت منام و طعام کے بڑے معتاد ہیں، مجھ کو یقین نہ ہوتا، مگر میں نے خود تجربہ کیا ہے، کھانا بالکل چھوڑ دیا ہے عجیب حالت ہے، امید ہے کہ یہ بہت جلد کچھ ہو جائیں گے، قصہ مختصر برم پور کے اسٹیشن پر وہ رفیق سفر اتر گئے، اور فقیر دو اسٹیشن آگے بڑھ کر نگینہ کے اسٹیشن پر اترا، اور سرائے میں آکر ٹھہر گیا،

(باقی)

علی مرداں خان

از

ڈاکٹر محمد عبد اللہ صاحب چغتائی، ایم، اے ڈی لٹ

مجھے اپنی تالیف "تاج محل آگرہ" کی تحقیق و تلاش کے سلسلہ میں بہت سی کتابیں اور مسودات دیکھنے کا اتفاق ہوا، چنانچہ ہندوستانی فن تعمیر کی تاریخ مصنفہ فرگسن میں جہاں تاج محل کا ذکر آیا، وہاں مسٹر فرگسن کے جانشین ڈاکٹر برگیس نے ایک حاشیہ میں لکھا ہے:-

"......... اغلب ہے کہ تاج محل کا نقشہ علی مرداں خان ایک ایرانی مہاجر نے بنایا ہے"[1]

اسی طرح علی مرداں کی بنائی ہوئی ایک تصویر قلعۂ دہلی اور عجائب گھر میں ہے، جو فنی حیثیت سے معاصر معلوم ہوتی ہے، اسکے نیچے انگریزی میں لکھا ہے:-

"......... اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ہندوستانی فن تعمیر میں امرود نما تاتاری گنبد رائج کیا، جس کی مثالیں جامع مسجد دہلی، اور تاج محل آگرہ میں دیکھی جاسکتی ہیں"[2]

---

[1] تاریخ فن تعمیر ہند ص ۳۰۶ جلد دوم مطبوعہ ۱۹۱۰ء [2] فہرست دہلی میوزیم ص ۹۵ نمبر آل انڈیا اورینٹل کانفرنس منعقدہ لاہور ۱۹۲۸ء عیسوی میں میں نے ایک مضمون اس عنوان پر پیش کیا تھا، جو اس وقت نا مکمل تھا، یہ امرود کی تمثیل بلب نما گنبد کیلئے عمل صالح میں مذکور ہے، ص ۳۰ ج ۲ میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی اور لفظ اسکے لئے نہیں ہو سکتا تھا، انگریزی میں اسے (Bulbous.) لکھا ہے،

تاریخی اعتبار سے دونوں امر بے بنیاد ہیں، کیونکہ علی مردان خاں کے ہندوستان میں آنے
۱۰۴۷ھ سے قبل تاج کافی سے زیادہ تعمیر ہو چکا تھا اور مردہ نما گنبد اس سے بھی قبل مغل اپنی عمارتوں
میں استعمال کر رہے تھے، جس کی اکثر مثالیں موجود ہیں، بہر حال اس سے علی مردان خاں کی شخصیت
فن تعمیر میں ممیز ضرور نظر آتی ہے، اسلئے ضرورت ہے کہ اسکے متعلق تحقیق سے کام لیا جائے، ذیل
کے صفحات میں اسکی شخصیت اور بحیثیت ماہر فن اسکی قابلیت اور اس سے متعلق دوسرے امور پر روشنی
ڈالی جاتی ہے،

ابتدائی خاندانی حالات

علی مردان خاں کا والد گنج علی خاں ازبک قبائل کا کرد، اور شاہ عباس کا ملازم تھا، اور
ایام طفولیت ہی سے اس نے ازبکیہ خراسان اور گرد و نواح کی لڑائیوں میں بہادرانہ خدمات انجام
دی تھیں، اسلئے بادشاہ نے خوش ہو کر اس کو ارجمند بابا کا لقب عطا کیا تھا[1]، تقریباً تیس سال تک ولایت
کرمان کو سنبھالا، ۱۰۳۴ھ میں اسکے انتقال کے بعد اس کا لڑکا علی مردان خاں اس کا جانشین ہوا، بادشاہ
نے اس کو بھی بابا ثانی کے لقب سے ملقب کیا، ادھر ۱۰۳۷ھ میں جب ہندوستان
میں شاہجہاں سریر آرائے سلطنت ہوا، تو اسکی آنکھیں حصار قندھار پر لگ رہی تھیں، وہ چاہتا
تھا کہ وہاں کسی شہزادہ کو فتح کی غرض سے بھیجے،

قندھار پر شاہجہاں کا تسلط

چنانچہ شاہجہاں نے دکن اور بندیلوں کی مہم سے فراغت کے بعد ذوالقدر خان
کو خفیہ علی مردان خاں کے پاس بھیجا، اس نے اپنے بادشاہ کے معمور خزانوں
اور اسکی فوجی قوت کا حال علی مردان خاں سے بیان کیا، اور اس کے الطاف و اکرام کی امید دلا کر کہا
کہ شاہجہاں کی اطاعت قبول کر کے حصار قندھار کو حوالے کر دو، جو پہلے بھی اسی کے خاندان کے
قبضہ میں تھا، اور تم خود شاہجہاں کے پاس چلو ورنہ بہت جلد لشکر شاہی سارے زابلستان کو تسخیر کرلےگا،

[1] عالم آرائے عباسی مطبوعہ ایران صفحہ ۹۲۳،

علی مردان خاں نے ذوالقدر کی بڑی خاطر تواضع کی، اور یہ وعدہ کر کے رخصت کر دیا، کہ اس کا جواب
کسی معتمد کے ہاتھ بھیج دیا جائے گا،
شاہجہان سیاسی حیثیت سے قندھار کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا اس قدر خواہاں
تھا، کہ جب اس نے علی مردان خاں کو اپنی طرف کسی قدر مائل دیکھا، تو اسے یار وفادار کے نام
سے خطوط لکھے، چنانچہ مولینا جان محمد قدسی شاعر دربار کا نظم کیا ہوا مکتوب شاہجہاں نامہ میں موجود
ہے، جس کا عنوان "نامہ بادشاہ بہ علی مرداں خان" ہے،
شاہجہان نے جو فرمان ارسال کیا تھا، اسکے ابتدائی الفاظ اور چند اشعار اور قدسی کا منظوم نامہ
نقل کیا جاتا ہے، دونوں کے اشعار میں کچھ فرق ہے، ممکن ہے قدسی نے بعد میں اس میں کچھ
ترمیم کی ہو،

نقل فرمان شاہجہان کہ بہ علی مردان خان نوشتہ،

"مدار دولت پادشاہی باعث امن و امان ممالک شہنشاہی شیر صفدر معرکہ آرائی
روز جنگ ملک کشائی بیدرنگ زبردست نامدار بخت اورنگ قاتل کفار کشور فرنگ
باج ستان روم و زنگ یار وفادار بے ریب علی مردان خاں بہادر فیروز جنگ"

بروے صبا پیک گلزار ما — خبر بر بیار وفادار ما
کہ خود را بدرگاہ والا رساں — ز سر چشمہ کشتی بدریا رساں
عناں گرم گرداں برچوں صبا — بداں گونہ کز کوہ آید صدا،
دعا چوں رود جانب آسمان — بسرعت چناں باید آید چناں،
ز شوق ایں قدر بود گفت و شنود — سخن مختصر بود و شتاب زود

نامۂ منظوم[1]

بروائے صبا پیک گلزار ما
خبر دہ بہ یار وفادار ما

کہ خود را بدرگاہ والا رساں
زسرچشمہ کشتی بدریا رساں

عناں گرم گرداں برہ چوں صبا
بدانساں کہ از کوہ آید صدا

بزور آمدن برفروزاں چراغ
کہ طی مکاں گردد آں رشک داغ

چناں پائے سرعت برآور زگل
کہ زود آمدن ہم بود زاں خجل

چناں زود باید بمنزل رسی
کہ پیش شد خجلت از واپسی

بسرعت برانگیز توسن چناں
کہ با گیریم اول آخر عناں

نیاید ز تعجیل ہم شوق کام
زسرعت قدم پیشتر نہ دو گام

عناں را بہ تعجیل کن روشناس
ز اخلاصِ خود شوقِ ما کن قیاس

دعا چوں رود جانب آسماں
بسرعت چناں باید آمد چناں

تو ایں رہ کہ اخلاص پیمودہٗ
زما شوق بر شوق افزودہٗ

چو کشتی بہ لنگر بہ پیمائے راہ
کہ خالیست جایت دریں بارگاہ

چناں باید آمد براہ از شتاب
کہ لب تشنہ خود را رساند بہ آب

گرت باشد از خواہش ما خبر
ز پیش آمدن ہم رسی پیشتر

بسرعت چناں باید آمد چناں
کہ آواز آید بگوش از دہان

قدم نہ ز پیش آمدن ہم ز پیش
کہ شد شوق و ید از اندازہ بیش

[1] کلیات قدسی کتبخانۂ خدابخش مرحوم پٹنہ، میں ان اشعار کیلئے خان بہادر عبدالمقتدر خان کا ممنون ہوں،

رہ شوق باید چناں کرد سر
کہ اول خود آئی و آخر خبر

چناں پائے نہ در رکاب از شتاب
کہ حیرت فزاید بچشم رکاب

شتابندہ شو اے نسیمِ سحر
بیار وفادار ما دہ خبر

کہ نزدیک چوں شد زمانِ وصال
بیفزودن شوق باشد محال

بدیدارت از ہر چہ آید بیاد
بود رغبت طبع اشرف زیاد

۱۰۳۸ھ میں شاہ عباس کی وفات پر دولت ایران خطرہ میں نظر آتی تھی، شاہ عباس کے جانشین شاہ صفی کو علی مردان خان سے اندیشہ پیدا ہو گیا تھا اسلئے دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے، علی مرداں خاں چونکہ اعلیٰ حضرت شاہجہاں کے ارادوں سے واقف ہو چکا تھا، اس نے سعید خان صوبہ دار کابل کی وساطت سے خط لکھا کہ شاہ صفی میری جان کے درپے ہے، چنانچہ ۱۰۴۷ھ میں سعید خان اور قلیچ خان صوبہ دار لاہور شاہی حکم کے مطابق قندھار روانہ ہوئے،

بعض حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہان کے اہل کار بھی قندھار کے سلسلہ میں علی مردان خاں سے غائبانہ خط و کتابت کرتے رہے تھے، قلیچ خاں کا ایک خط بنام علی مردان خاں محمد صالح کی بہار سخن[1] سے لیکر ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

"تقدیم مراسم محبت و یگانگی غائبانہ از جانب عمدہ امرائے سمو المکان قلیچ خان بسند آرائے حکومت قندھار خانِ عالی شان علی مردان خان،

ایزد تقدس و تعالیٰ ذات فائض البرکات آن گوہر معدن مردی مروت اختر سمائے عزت و دولت خلاصۂ دودمان عظمت و ایالت نقاوہ خاندان حشمت و جلالت

[1] بہار سخن ورق نمبر ۳، لاہور پبلک لائبریری نمبر ۴۸۰ وذاتی نسخہ،

را از جمیع مکارم روزگار بخردش داشتہ معزز و کامیاب صورت و معنی دارد از بس کہ بہ جمیع مکارم اخلاق سینہ و محامد و اوضاع رضیہ از افواہ السنۂ خلائق بگوش معنی نیوش رسیدہ طبیعت مہر سرشت را با شمائل حسنہ آن قدر مراتب آشنائی پدید آمدہ، کہ گویا سالہائے دراز دیدہ حق بیں از انوار جمال چہرہ نورآگین منور گردیدہ بارہا صحبت لازم المسرت راہ یافتہ است الحق ذات بزرگان والا صفات کہ آئینہ خاطر شان از مصقلہ عنایت الٰہی صفا یافتہ و شاہد طبیعت شان بزیور فضائل متجلی گردیدہ حکم آفتاب دارد، و صیت مکارم و محاسن ایشان مانند پرتو خورشید بہمہ جا میرسد و دقیقہ سنجان کارگاہ معنی کہ پرتو اندوزی انوار ایزدی چشم بینا یافتہ، از پردہ صنعت جمال صانع را مشاہدہ کردہ اند بمناسبت اختلاط عالم امرائے ایتلاف روحانی را ملاقات حقیقی اعتبار کردہ اصلاً متوجہ باتصال ابدانی نمی گردند پس بدین اعتبار ایں خیرخواہ خلق اللہ خود را از بہرہ مندان دیدار فائض الانوار دانستہ با حسن وجوہ حجاب بیگانگی را از میان مرتفع گردانند توقع از اں گوہر گرامی بحر آشنائی آنست کہ ابنائے را کہ ایں نیازمند درگاہ الٰہی بر سطح دوستی گذاشتہ آن عالیجاہ در استحکامش بدل جہد فرمودہ ہمت را بر اتمام تعمیرش گمارند و با علام مقاصدے کہ دریں ضلع روے دہد بے حجابانہ مرہون منت می گردانیدہ باشند، تا مراتب دوستی خاص بر عوام کوتاہ بیں، بدرجہ تحقیق پیوندد ایام دولت بختیاری مساعد باد"،

سعید خان نے پہلے ہی وہاں پہونچکر معلوم کر لیا تھا، کہ جب تک سیاوش قلماقی جسے شاہ صفوی نے علی مردان خاں پر متعین کر دیا تھا، قندھار کے قرب و جوار میں ہے، اس وقت تک یہاں کی رعایا پوری اطاعت قبول نہیں کر سکتی، اسلئے سعید خان نے علی مردان خان کو ساتھ لیکر

سیاوش سے قلعہ کے ایک میل کے فاصلے پر جنگ کی، قزلباش بھاگ نکلے، اور فاتح ان کا ساز و سامان لیکر قندھار پہونچے، اور قلیچ خاں قندھار کا والی مقرر ہوا،

علی مردان خان کا ورود لاہور

اسکے بعد علی مردان خان نے لاہور کا رخ کیا، اور ۱۰۴۸ھ یعنی بارہویں سنہ جلوس کو شاہجہان عازم لاہور ہوا[1]، اور آگرہ اور کانگڑہ وغیرہ کی سیر کرتا ہوا لاہور پہونچا، تمام صوبہ داروں نے حسب حیثیت نذرانے اور تحائف پیش کئے، اور بادشاہ بڑی دھوم دھام سے سکہ نچھاور کرتا ہوا قلعہ لاہور میں داخل ہوا، شاہی فرمان کے مطابق معتمد خان میر بخشی تربیت خان اور بخشی ثانی نے علی مردان کا دیوان عام کے دروازہ تک خیر مقدم کیا، اور جانثاران سے اس کا تعارف کرایا،

علی مرداں خاں نے دربار ایران کے دستور کے مطابق بادشاہ کی خدمت میں آداب بجالا کر ایک ہزار اشرفی نذر پیش کی، خان کو خدمت شاہانہ سے مرصع دستار، تلوار اور ڈھال مع خلعت اور امیر کا لقب عطا ہوا، چھ ہزاری منصب ملا، اسکے علاوہ بیس گھوڑے، چار ہاتھی، اور دوسرے ساز و سامان سے عزت افزائی کی گئی، اور خاص شاہی خزانہ سے قندھار سے لاہور تک کے اخراجات سفر دس لاکھ دیے گئے، اور لاہور کی بہترین عمارات میں سے اعتماد الدولہ کی حویلی قیام کیلئے ملی اسکے ہمراہی اور خدمت گار بھی شاہی جود و کرم سے محروم نہ رہے[2]

کشمیر کی صوبہ داری

چونکہ علی مردان خان سرد ملک سے آیا تھا، اسلئے بادشاہ نے اسے کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا، اور اس کے اعزہ علی بیگ، عبداللہ بیگ، اسمٰعیل بیگ وغیرہ کو بھی اعلیٰ مناصب پر سرفراز کیا، پھر جب بادشاہ کابل کی طرف روانہ ہوا، تو علی مرداں خان کو کشمیر جانے کی اجازت ملی پھر کابل سے واپسی کے بعد ۱۰۴۹ھ میں علی مرداں خان لاہور میں طلب کیا گیا، اور منصب

[1] عمل صالح ج ۲ [2] ایضاً جلد ۲ ص ۲۹۰

ہفت ہزاری ذات اسوار پر فائز ہوا، اور کشمیر و لاہور کا نائب السلطنت مقرر کیا گیا، تاکہ گرمی اور سردی کسی موسم میں اسکو تکلیف نہ ہو،

علی مردان خاں منتظم کی حیثیت سے

سنہ ۱۳ جلوس مطابق ۱۰۴۹ھ میں حسب دستور بادشاہ کی اجازت سے علی مردان خان کے ملازموں نے شب برات کے موقع پر قلعہ لاہور کو جھاڑ فانوس اور دوسرے چراغان کے سامانوں سے مزین کیا، اور جو آتشبازی ایرانی طریقہ پر بنائی گئی تھی حسن انتظام کے ساتھ بادشاہ کے سامنے چھوڑی گئی، بادشاہ نے جھروکہ میں بیٹھ کر اس کا لطف اٹھایا،[1]

علی مردان خاں عرصہ تک کشمیر و لاہور میں رہا، اور وہاں اپنے حسن انتظام سے بہت سے کار خیر کئے، جس کی وجہ سے آج تک وہ احترام کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے،

ایک دفعہ کشمیر میں سخت قحط پڑا، لوگ بہت سراسیمہ ہوئے، علی مردان خاں نے فوراً پنجاب خصوصاً جالندھر وغیرہ سے بہت بڑی مقدار میں غلہ منگا کر لوگوں کی جان بچائی، یہ وہ انتظام تھا جسے اس کے پیشرو نہ کر سکے تھے،[2] اسکے ان اوصاف کی وجہ سے شاہجہاں اس سے بہت خوش تھا،

سنہ ۱۴ جلوس مطابق ۱۰۵۰ھ میں بادشاہ نے سعید خاں کو والی کابل مقرر کیا، اور سنہ ۱۶ جلوس میں جب اکبر آباد میں رونق افروز ہو ئے تو علی مردان خان کو حضور میں طلب کرکے امیر الامراء کا خطاب اور ایک کرور دام نقد عطا کیا، اور اعتقاد خاں کی حویلی جو جمنا کے کنارے امراء کی بہترین حویلیوں میں سے تھی (یہ حویلی اعتقاد خاں نے بادشاہ کو بطور تحفہ دی تھی) رہایش کے لئے مرحمت ہوئی، پھر علی مردان خاں صوبہ کابل بھیجا گیا،[3]

پابندی مذہب

علی مردان خاں میں مذہبی جذبہ بھی تھا، چنانچہ وہ ہمیشہ لوگوں کو مذہب کی پابندی

[1] تاریخ لاہور عبد اللطیف ص ۵۵، [2] اسلامک کلچر ان کشمیر مصنفہ صوفی محی الدین،
[3] بادشاہ نامہ عبد الحمید لاہوری،

کی تلقین کرتا رہتا تھا، رمضان میں خاص طور سے لوگوں کو صوم و صلوٰۃ کی پابندی کی تاکید کرتا تھا، ایک دو مرتبہ اسے لاہور میں رمضان کرنے کا اتفاق ہوا، یہاں لوگوں کو تارک صوم اور آوارہ گرد دیکھکر انھیں فہمایش کی، جب وہ راہ راست پر نہ آئے، تو سب کو بیگار کیلئے کابل بھیجدیا،

علی مردان خان کی تعمیرات

ہندوستان کی قدیم عمارتوں کو دیکھکر ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں، کہ وہ مختلف دوروں میں مختلف سلطنتوں کا آماجگاہ رہا ہے، جسکے آثار و نشان ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں، ہر ایک نے اپنے عہد میں اپنے اپنے ذوق کی خصوصیات تعمیر کو مد نظر رکھا ہے، جو مقامی حالات، طبائع اور ذوق کے اختلاف کا پتہ دیتے ہیں، اس پہلو سے جب ہم تحقیق کی نگاہ ڈالتے ہیں، تو عہد مغلیہ میں بھی اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی تعمیرات بالکل مختلف نظر آتی ہیں، خاصکر وہ عمارتیں جو شاہجہانی عہد میں علی مردان خاں کے اہتمام میں تعمیر ہوئیں، جن میں کاشی کاری کے علاوہ اور بہت سی وسط ایشیائی فن کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، اس ضمن میں پنجاب زیادہ ممنون احسان ہے، معلوم ہوتا ہے کہ علی مردان خان نے تعمیر کا فن وراثت میں پایا تھا، قندھار میں اب تک ایک باغ اس کے والد گنج علی خان کے نام سے منسوب ہے، ممکن ہے قندھار اور کابل میں اور عمارتیں بھی اس خاندان کی یادگار ہوں،

مختلف کتابوں میں ایسے متفرق حالات ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ علی مردان خان نے ہندوستان میں بہت سی عمارتیں بنائی تھیں، ان میں سے بعض کے تو محض نام ملتے ہیں، اور بعض کے کسی قدر تفصیلی حالات، چنیوٹ میں شاہ برہان کا مقبرہ ابھی تک موجود ہے، دکھنی سرائے ضلع جالندھر میں نور محل قریب قریب ۱۰۵۰ھ میں تعمیر ہوا جس پر کاشی کاری اعلیٰ درجہ کی ہے، ضلع گوجرانوالہ موضع سودھرہ میں مردان خاں نے شاہجہاں کے حکم سے اپنے لڑکے ابراہیم کے نام پر ابراہیم آباد بسایا، جو اب مٹ چکا ہے، میں نے اس مقام کو دیکھا ہے، اب محض ایک

ٹیلہ سارہ گیا ہے، جس پر جدید سودھرہ آباد ہے، جس زمانہ میں وہ کابل کا صوبہ دار تھا، اس زمانہ میں اس نے پشاور کے قریب ایک باغ تعمیر کیا[1]، اور کابل میں ایک منڈی بنوائی، جو آج تک فنِ تعمیر کا عمدہ نمونہ تصور کی جاتی ہے، پشاور میں اصفہان کے نمونہ پر ایک مسقف بازار تعمیر کیا، اور اس کے کونوں پر ہشت برج بنوائے اس کا ایک نقشہ اس نے مکرمت خاں شیرازی کو دہلی روانہ کیا تھا جب کہ دہلی کا قلعہ اور دوسری عمارتیں اسکی نگرانی میں تعمیر ہو رہی تھیں، تاکہ مکرمت خان اس نقشہ سے ان عمارتوں میں فائدہ اٹھا سکے، اس سے ہم مکرمت خان شیرازی اور علی مردان خاں کی تعمیری قابلیت کا اندازہ کر سکتے ہیں (یا اول الذکر کی نگرانی میں تاج محل آگرہ اور دہلی کی عمارتیں تعمیر ہوئیں، دہلی کی عمارتوں کی بنیاد ۱۰۴۸ھ یعنی اس زمانہ میں پڑی تھی، جب کہ علی مردان خان ہندوستان میں وارد ہوا تھا) پھر جب وہ بحیثیت صوبہ دار پنجاب کشمیر گیا، تو وہاں اکثر عمارتیں بنوائیں چنانچہ شہر میں ایک ایسی سنگین پاکیزہ اور خوش منظر حویلی تعمیر کرائی، جو رہ گذار کے لئے اسکی ایک بے مثال یادگار ہے، اس میں نہایت قرینہ سے جابجا آبشار اور فوارے ہیں، پرگنہ پھاگ موضع تیل بل میں ایک باغ مع پختہ چہار دیواری تیار کرایا، اور اسکی سیرابی کے لئے پہاڑ سے نہر کاٹ کر لائی گئی، اور اس میں بہت بڑے بڑے حوض بنوائے، ایسے حوض کشمیر کے کسی باغ میں نہیں پائے جاتے تھے، تھوڑے ہی عرصہ میں اس باغ کو میوہ دار درختوں سے بھر دیا،

---

[1] ۱۹۳۰ء میں میرا ایک مضمون تاج محل پر معارف میں شائع ہوا تھا جو میں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے ایک جلسہ میں پڑھا تھا، اس میں میں نے اس مسقف بازار کا ذکر کیا تھا جسے پڑھکر مہتمم صاحب شعبۂ فیع الاسلام پشاور نے معارف مارچ ۱۹۳۱ء میں ایک مکتوب میں بتایا تھا، کہ یہ بازار کابل میں تعمیر کرایا گیا تھا اور اب تک موجود ہے، اس کا نام چھتہ بازار ہے، کابل میں ایک محلہ بھی آباد ہے جسکا نام "باغ علی مردان خان" ہے، بہرحال یہ خوافی خان کا بیان ہے (منتخب التواریخ ص صفحہ ۴۲۱)

اس باغ کی آمدنی علی مردان خاں نے مشہد مقدس روضۂ حضرت امام رضا کے لئے وقف کر دی تھی (علی مردان خاں شیعہ تھا) اسکو معلوم ہوا کہ مسافر اکثر ایسی جگہ پیدل سفر کرتے ہیں، جہاں کوئی قیام گاہ نہیں ہوتی، اور راستہ سخت دشوار ہوتا ہے، اسلئے اس نے کوہ پنجال میں ایک سرائے بنوائی، دوبارہ ہولا کے راستہ میں حضرت علیؓ کے نام پر دو موضع علی آباد آباد کئے، کشمیر کے ان راستوں کو جن پر مسافر ہلاکت کے خوف سے بمشکل سے سفر کرتے تھے، درست کرایا، غرض کشمیر کے دشوار گذار راستوں کو مسافروں کے لئے بہت آرام دہ بنادیا،

ضلع شاہجہاں پور میں جہاں نورجہاں کے نام سے ابتک نورنگر موجود ہے، علی مردان خان نے شاہجہاں کے حکم سے ایک شکارگاہ بنوائی، جہاں بادشاہ سلامت بیٹھ کر شکار کھیلا کرتے تھے، یہ شکارگاہ غالباً ابھی تک موجود ہے،

شالامار باغ لاہور جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۰۴۷ھ میں تعمیر ہوا، جیسا کہ اس کی تاریخ گفتا کہ بگو نمونہ خلد بریں سے معلوم ہوتا ہے، لیکن اسکی سیرابی اور شادابی کا مسئلہ جو دراصل اس باغ کی جان ہے، علی مردان خان نے حل کیا تھا، اسکی نکالی ہوئی نہر اب تک موجود ہے، جو اس باغ کو سیراب کرتی ہے، عالمگیر نے ایک مکتوب[1] میں جس میں اس نے اپنے کرنال سے چل کر باغ آغرآباد دہلی میں ٹھہرنے کا ذکر کیا ہے، اس باغ کو فاضل خاں کے نام سے منسوب کیا ہے، جو علی مردان خاں کے ماتحت کام کرتا تھا، مگر اس باغ کے قریب جو نہر ہے، وہ غالباً وہی ہے جو قلعہ کی قدیم نہر سے لائی گئی تھی، اس پر ایک پل اسی کے مشورہ سے بنوایا گیا تھا، پل کی ایک اور عمدہ مثال ہم کو کابل میں ملتی ہے، یہ سرخ پل کے نام سے موسوم ہے اور کابل سے جلال آباد جاتے ہوئے پانچویں منزل پر واقع ہے، یہ پل علی مردان خاں کی تعمیر ہے، جیسا کہ اسکی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے:-

[1] آداب عالمگیری،

درزمانِ ثانیِ صاحبقراں شاہجہاں بادشاہِ دادگسترظلِ وہابِ وحید

خانِ عالیشاں علی مرداں شد از بہرِ خدا بانی ایں پل بفالِ خرم وبختِ سعید

سالِ تاریخش چو جستم از خرد داد ایں جواب

بانی ایں پل علی مرداں شد از لطفِ مجید

انکی تعمیرات میں ایک خود اس کا مقبرہ ہے، جسے اس نے اپنی والدہ کے لئے بنوایا تھا لیکن خود بھی اسی میں مدفون ہوا، اور اب یہ مقبرہ اسی کے نام سے مشہور ہے، اس مقبرہ کا ذکر اس کی وفات کے حالات میں آئیگا،

ایک مخطوطہ میں جس میں علی مرداں خاں اور اسکے خاندان کا پورا شجرۂ نسب ہے، یہ بھی لکھا ہی کہ اس نے قلعہ، نہر، شہر پناہ اور جامع مسجد دہلی تعمیر کی، غرض کہ شاہجہاں خود بہت بڑا ماہر تعمیر کا تھا، اور اس کے دربار میں بھی ایسے ہی لوگ جمع ہو گئے تھے،

یہ علی مردان خاں کی فنی قابلیتوں کا مختصر سا خاکہ ہے۔ (باقی)

ا۔ ان تعمیرات کے حالات میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے، :-

تاریخ کشمیر مصنفہ محمد عظیم فارسی صفحہ ۲۱، صفحہ ۲۱۱، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۶ء، امپریل گزٹ جلد نمبر ۱ صفحہ ۹۳ وجلد نمبر ۲۱، صفحہ ۳۶۹، وجلد نمبر ۲۲ صفحہ ۳۲۸، جلد نمبر ۸، صفحہ ۱۶-۱۷، آثار تاریخ دہلی مصنفہ بشیرالدین جلد ۲ صفحہ ۴۵۰ مآثر الامرا صفحہ ۲۰۵، و انڈین آرٹ جرنل نمبر ۸ ۱۸۸۹ء صفحہ ۳۰ و نمبر ۱ صفحہ ۳، خلاصۃ التواریخ سبحان رائے صفحہ ۲۰ و تاریخ لاہور سید محمد لطیف ص ۵۲ و ۵۵؛

بقائے انسانی

کے

خلاف دو اعتراضوں کا جواب

از

جناب خواجہ عبدالحمید صاحب ایم اے لکچرار گورنمنٹ کالج گجرات

(۲)

اسی طرح اس انتقالی نظریہ کی وجہ سے ہم تصور دہلیز[1] سے بھی متفق ہو جاتے ہیں، یہ وہ تصور ہے، جسے فکنر نے اپنی کتاب "طبعیات نفسی" میں پیش کیا تھا، اور آج نفسیات جدید کا ہر ماہر اس کا ورد کر رہا ہے، فکنر کا خیال ہے، کہ شعور ظاہر ہو ہی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ایک خاص کمیت کی نفسی طبیعی حرکت پیدا نہ ہو جائے، یہ حرکت جب ایک خاص درجہ تک پہونچ جاتی ہے، تو شعور ظاہر ہوتا ہے، حرکت کے اس درجہ کو وہ دہلیز کہتا ہے، اس دہلیز کی اونچائی

ا۔ اگر میرے منہ کے اندر ایک چھوٹا سا ذرہ شکر کا ڈالا جائے، تو میں مٹھاس محسوس نہ کرونگا لیکن اگر ایک ایک کر کے چند ذرات اور ڈالے جائیں، تو ایک وقت آئے گا کہ میں کہدوں کہ ہاں اب مٹھاس معلوم ہوتی ہے، یہ ہو گی مٹھاس کے احساس کی دہلیز، فرض کیا کہ تین ذروں کے بعد مٹھاس کا احساس ہوا، تو ہم کہیں گے، کہ اگر محرک کی مقدار تین ذرات سے کم ہو تو احساس مٹھاس دہلیز کے ادھر نہ آئے گا، یعنی کوئی مٹھاس محسوس نہ ہو گی، (مترجم)

مختلف حالات میں مختلف ہوتی ہے، کبھی وہ چڑھتی ہے، کبھی گرتی ہے، جب یہ دہلیز گرتی ہے
مثلاً جب ہم پر عرفان کی خاص کیفیت طاری ہوتی ہے، تو ہمیں ایسی اشیاء کا شعور ہو جاتا ہے،
جن کا عام حالت میں ہمیں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا، جب یہ دہلیز چڑھ جاتی ہے، مثلاً نیم خوابی
کے وقت، تو شعور نیچے کے درجہ تک گرجاتا ہے، اب کیا دہلیز کا اس طرح چڑھنا اور گرنا دوسرے
الفاظ میں وہی بات نہیں ہے، جسے ہم نے پیش کیا ہے، کہ مغز ایک پردہ یا رکاوٹ ہے، جس
سے گذر کر شعور اس دنیا میں پہنچتا ہے، اور یہ پردہ کبھی زیادہ کثیف ہو جاتا ہے اور کبھی کم،
یہ نظریۂ انتقالی ہمیں مشاہدات انسانی کی ایک ایسی شق سے قریب تر کر دیتا ہے، جو
نظریۂ تولیدی کے زاویۂ نگاہ سے قریب قریب ناقابلِ فہم ہے، یہاں میں ان مبہم اور غیر معمولی
مشاہدات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں، جو تاریخ انسانی کے ہر دور میں بیان ہوئے ہیں، اور
جن کی حقیقت کو آج کل مسٹر فریڈرک[1] مائرز محققین[2] علم الارواح کی ایک جماعت کی مدد سے علمی دنیا
کے سامنے واضح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، مثلاً ایسے حوادث اور مشاہدات، مذہبی لحاظ
سے تغیر قلب، دعا کے جواب میں فضل الٰہی سے ہدایات، فوری شفار، پیشین گوئیاں، موت کے
وقت روحوں یا صورتوں کا مشاہدہ، غیبی حوادث کا غیبی[3] مکاشفہ، عاملانہ[4] استعداد کی مختلف حالتیں
اور کیفیتیں، اور بہتیرے ایسے حوادث جو ان سے بھی زیادہ غیر معمولی اور ناقابلِ فہم ہیں، اگر یہ صحیح
ہے، کہ ہمارا فکر یا شعور ہمارے مغز کی ایک ماموریت ہے، اور یہ حوادث جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے

۱؎ Mr: Frederic Myers
۲؎ Psychical Researchers
۳؎ Clairvoyance
۴؎ Mediumistic capacities

امور واقعہ ہیں (میرا عقیدہ ہے کہ ان میں سے بعض تو یقیناً امور واقعہ ہیں) تو ہمیں ماننا پڑے گا، کہ یہ
حوادث ہرگز بغیر کسی تمہیدی مغزی حرکت کے ظہور پذیر ہو نہیں سکتے، لیکن ظہور شعور کے متعلق جو
عام تولیدی نظریہ رائج ہے، وہ حرکتِ مغزی کے اس خاص مفروضے کے ساتھ جکڑ دیا گیا ہے،
کہ ہر قسم کی مغزی حرکت معلول ہوتی ہے جسم انسانی کے اعضاے حس کی کسی ایسی ماقبل حرکت
کی، (خواہ وہ حرکت فوراً پہلے ہوئی ہو یا کافی عرصہ پہلے) جو مغز پر اثر کر چکی ہو، اس عمل کا نتیجہ ہوتا
ہے، کہ مغز احساسات[5] اور شبیہوں کو پیدا کرتا ہے، پھر ان احساسات اور شبیہوں سے فکر و عرفان
کی اعلیٰ حالتیں درجہ بدرجہ بنتی ہیں، انتقالی نظریہ کے مطابق ہمیں بھی یہ ماننا پڑتا ہے، کہ عام فکر
اسی طرح بنتا ہے، اور عمل حاسہ سے مغزی رکاوٹ کی دہلیز گر جاتی ہے، مثلاً اس وقت میری
آواز اور میری صورت آپ کی آنکھوں اور کانوں پر اثر کر رہی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ
کا مغز زیادہ اثر پذیر ہو گیا ہے، اور اسی وجہ سے پس پردہ عالم سے میری شخصیت اور میرے کلام
کا عرفان آپ کے ذہن میں اتر آیا ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا، کہ اُن بعید از فہم قیاس اور
مبہم حوادث میں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، ہمارے اعضاے حس کیا کام دے سکتے
ہیں، مثلاً ایک عامل اپنے سائل کو ذاتی اور مخفی حالات کی اطلاع دیتا ہے، حالانکہ بظاہر
یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے، کہ اس عامل نے یہ علم اپنی آنکھوں یا کانوں سے حاصل کیا ہو، یا ان ذرائع
سے اخذ کیا ہو، یا فرض کیجئے، کہ آپ کو ایک ایسے شخص کی صورت نظر آ رہی ہے، جو اس وقت
سینکڑوں میل کے فاصلہ پر دم توڑ رہا ہے، نظریہ تولیدی ہمیں ہرگز نہیں بتاتا کہ کن احساسات
کی مدد سے ہمیں علم و عرفان کے یہ بے تعلق اجزا یکایک مل جاتے ہیں، لیکن انتقالی نظریہ کے سامنے
یہ رکاوٹ نہیں ہے، وہ تو کہتا ہے کہ یہاں پیدا ہونیکا سوال ہی نہیں، عرفان کے یہ اجزا، عالم فوق التجربہ

۵؎ Sensations & Images

ہیں موجود ہیں، جونہی ہمارے مغز کی دہلیز یا رکاوٹ نیچے گری، یہ اجزاء ہمارے ذہن میں داخل ہو گئے، مثلاً جن لوگوں پر تغیر قلب[1]، ہدایات ایزدی، فوری روحانی شفا وغیرہ کی حالتیں گذری ہیں، وہ کہتے ہیں، کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک خارجی یا غیبی طاقت جو معمولی حواس کی زندگی سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ہم میں ساری ہو جاتی ہے، اور ہمیں اُس فوق الفطرت زندگی میں پہونچا دیتی ہے، جہاں خود اس کا سرچشمہ ہے، سویڈن بورگ[2] کے مرید حلقے اس حالت کیلئے دخول یا سرایت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، یہ الفاظ اس عجیب عرفان کو اور اس نئی حالت و کیفیت کو جو ہم پر دریا کی موج کی تیزی سے طاری ہو جاتی ہے، بخوبی ادا کرتے ہیں، اب یہ مشاہدات جو تولیدی نقطۂ نظر سے بالکل بے معنی اور ناقابل فہم ہیں، ہمارے اس انتقالی نظریہ سے بالکل صاف اور واضح ہو جاتے ہیں، اور ہمیں صرف یہ کہنا پڑتا ہے، کہ ہمارا شعور ایک فوق الفطرت سمندر سے متصل و ملحق، اور اثر پذیر ہے، اور اس سمندر کی لہریں خاص خاص حالتوں میں ہمارے مغزی پشتوں کو پار کرکے ذہن میں اتر آتی ہیں، البتہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ مغز انسانی کی یہ رکاوٹی دہلیز خاص خاص اوقات میں کیوں گر جاتی ہے، اس سوال کا جواب نہ ہمارے پاس ہے اور نہ فریق مقابل کے پاس،

اب آپ انتقالی نظریہ کی خوبیوں میں ایک فائدہ اور بھی بڑھا لیجئے میں جانتا ہوں، کہ آپ میں سے بعض اصحاب اس فائدے کو کوئی خاص اہمیت نہ دیں گے، لیکن جب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں، کہ یہ انتقالی نظریہ حیات بعد الموت کے نظریہ سے بھی متفق ہے، تو آپ کو ماننا پڑے گا، کہ اس کے فوائد عام تولیدی نظریہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں، ایسے مسائل کی

[1] Conversion [2] یہ شخص Swedenborg جزیرہ نمائے سویڈن کا مشہور صوفی گذرا ہے، اور اسکی صوفیانہ تصانیف یورپ کے صوفی منش طبقوں میں بہت رائج ہیں، (مترجم)

تاریخ کو اگر دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا، کہ یہ نقطۂ نظر کلی طور پر کبھی نظرانداز نہیں کیا گیا تھا لیکن پوری وضاحت سے اُسے کسی نے پیش بھی نہیں کیا، فلسفہ کے مروجہ مذہب عینیت[1] نے جسم کو اس عالم رنگ و بو میں حیات روح کے لئے ایک ضروری شرط تصور کیا ہے، لیکن اس نے یہ بھی تسلیم کیا ہے، کہ جسم کی موت کے بعد یہ روح آزاد ہو جاتی ہے، اور خالص فکری اور غیر استنباطی حالت اختیار کر لیتی ہے کانٹ[2] اس خیال کو ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے، جو ہمارے نظریہ انتقالی کے بالکل مشابہ ہیں، وہ کہتا ہے، بلا شبہہ جسم کی موت ہمارے نفس کی حیاتی زندگی کے لئے خاتمہ کا حکم رکھتی ہے، لیکن نفس کی فکری زندگی کی ابتدا اس جسمانی موت سے ہو سکتی ہے، اس نقطۂ نظر سے ہمارا جسم ہمارے فکر کی علت نہیں ہے، بلکہ وہ اس فکر کے لئے ایک رکاوٹ کا کام دیتی ہے، یہ رکاوٹ ہمارے حیاتی اور حیوانی شعور کے لئے ضروری ہو سکتی ہے، لیکن ہماری خالص روحانی زندگی کے لئے وہ محض ایک رکاوٹ ہے، اور بس، مسٹر شیلر نے (جو پہلے امریکہ کی کارنل یونیورسٹی میں تھے، اور آج کل آکسفورڈ میں ہیں) پچھلے دنوں اپنی ایک نہایت معرکۃ الآراء تصنیف میں جس کا نام "سفنکس کی پہیلیاں"[3] ہے، اور جس کے متعلق مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے، کہ اسے وہ مقبولیت نہیں ملی، جو اس کا حق ہے) اس نظریہ انتقالی کو وضاحت سے پیش کیا ہے،

[1] ولیم جیمز کے زمانہ میں اور اس سے دو صدی پہلے عینیت یا Idealism کسی نہ کسی شکل میں یورپ کے مشہور فلاسفہ کی تصانیف میں پائی جاتی تھی، آج کل یہ کیفیت نہیں ہے، (مترجم)

[2] Immanual Kant جرمنی کا مشہور ترین فلسفی (۱۸ ویں صدی) جس کا شمار یورپ جدید کے بہترین مفکروں میں ہے، (مترجم)

[3] Riddles of the sphinx by F.C.S. schiller شیلر کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، (مترجم)

لیکن ابھی آپ کی تشفی نہیں ہوئی، آپ مجھ سے دریافت کریں گے، کہ ہم اس نظریہ کی مدد سے اپنے ذہن میں اپنی بقا کا تصور کیسے قائم کر سکتے ہیں؟ ہمیں ضرورت ہے ایسی بقا کی جس میں وہی خاصیتیں، وہی خصوصیتیں، اور وہی ذاتی حدبندیاں قائم ہوں جن کی وجہ سے ہم اس دنیا میں ایک دوسرے سے مختلف اور ممیز ہیں، اور جن پر ہماری شخصیتوں کا انحصار ہے، ہماری ذات کا انحصار ان ہی قیود اور ان ہی حدبندیوں پر ہے، ہمارا سوال یہ ہے کہ جب حدبندی کرنے والا آلہ (یعنی جسم یا مغز) گل سڑ جائے گا، اور ہماری روحیں "فرداً فرداً" اپنے اصلی منبع میں پہونچ کر تمام قیود سے آزاد ہو جائیں گی، تو کیا حیات کی یہ خوش آیند حدبندیاں جنھیں ہم اس دنیا میں اپنی اپنی شخصیت کا لقب دیتے ہیں، وہاں (یعنی اس عالم بالا میں) بھی اپنی ذاتی انفرادیت اور یگانگت اسی طرح قائم رکھیں گی، جیسی کہ وہ اس دنیا میں رکھتی ہیں، جہاں ہمارے اپنے اپنے دماغ (یا مغز) ہمارے لطف و فائدہ کے لئے اس فوق الطبیعی منبع سے اثر پذیر ہو رہے ہیں،؟ یہ وہ اہم سوالات ہیں جن کا حل اس انگرسول وقف کے لکچراروں کے لئے ضروری ہے، مجھے امید ہے کہ بعض مقرر ایسے آئیں گے، جو ہماری بقا کے شرائط کو نہایت غور سے دیکھیں گے، اور ہمیں بتائیں گے، کہ جب موت کے بعد ہماری قیدیں اور حدبندیاں کٹ جائیں گی، تو ہماری شخصیت میں سے کیا کیا کیفیتیں کم ہو جائیں گی، اور کون کونسی خاصیتوں کا اضافہ ہو جائے گا، اگر فلاسفہ کا یہ مقولہ صحیح ہے، کہ حدبندی ہمیشہ سلبی ہوتی ہے تو کوئی تعجب نہ ہوگا، اگر یہ دریافت ہو جائے کہ ہمارے مغز کی قائم کردہ قیود میں سے بعض کا (موت کے بعد) معدوم ہو جانا اس قدر برا نہیں ہے، جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے،

بہرحال اس وقت میرا یہ ارادہ ہرگز نہیں ہے، کہ ایسے پیچیدہ مسائل میں الجھوں میں اپنا باقی ماندہ وقت دوسرے مقام کی تشریح میں صرف کروں گا، یہ مقام بھی ایسا ہی سلبی اور تشنہ ہے جیسا کہ پچھلا تھا، لیکن اگر دونوں کو ملا کر دیکھا جائے تو امید بقا کے لئے پرواز کی قوت قدرے زیادہ

ہو جاتی ہے،

زمانہ حال میں ہماری قوتِ متخیلہ بہت زیادہ وسیع ہو گئی ہے، اس وسیع قوت متخیلہ کے مطابق ہمیں (اگر ہم حیات بعد الموت کے قائل ہو جائیں) اتنی زیادہ ہستیوں کی بقا تسلیم کرنا پڑے گی، کہ یہ خیال ہی ناقابل برداشت ہو جاتا ہے، میرا خیال ہے کہ اس مجلس کے حاضرین میں سے بعض اصحاب کیلئے یہ تعداد بھی سد راہ بن رہی ہے، اور میری خواہش ہے، کہ اس سد کو کلی اور مستقل طور پر آپ کی راہ سے ہٹا دوں،

میرا خیال ہے کہ یہ ذہنی رکاوٹ بالکل زمانہ حال کی پیداوار ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ سائنس نے اپنے نظریوں میں کمیت پر بہت زیادہ زور دیا ہے، اور اس کمیتی نقطۂ نگاہ کا اثر ہمارے اخلاقی احساس پر بھی بہت ہوا ہے،

ہمارے اسلاف کے لئے یہ دنیا بالکل چھوٹی سی تھی، اور اگر زمانہ حال کے تصورات سے اس کا موازنہ کیا جائے تو وہ چھوٹی کیا بالکل ننھی منی سی تھی، اس کے اعتبار سے دنیا کی عمر زیادہ سے زیادہ چھ ہزار سال ہوگی، اور اس میں بس چند بڑے بڑے انسان گذرے، مثلاً بادشاہ، علمائے دین، اولیائے کرام وغیرہ، یہ اکابر اپنی خصوصیات اور بزرگی کی وجہ سے ذہن انسانی پر حاوی تھے، چنانچہ اپنی اس فضیلت کی وجہ سے نہ صرف وہ، بلکہ ان کے حالی موالی بھی خداوند کریم کی کائنات میں ایک خاص عزت اور درجہ پا گئے، بقا کے صحیح حقدار یہی اکابر اور ان کے حالی موالی ہیں، ان کے بعد نسبتہً چھوٹے درجہ کے انسانوں اور معمولی فرقوں کے اولیا رکی باری آتی ہے، اس کے بعد ہما شما کا نمبر ہے، جو اس فردوس تصور کے لئے پس منظر کا کام دیتے ہیں، الغرض اسلاف کے ذہن میں "ابد" کا جو نقشہ تھا، اس میں مومنین صالحین کے لئے بھیڑ بھاڑ ہرگز نہ تھی (یہاں ابد کے اس نچلے اور آتشیں طبقہ کا ذکر نہیں ہے، جسے جہنم کہتے ہیں) اسلاف کی اس ذہنی تصویر کو

آپ بقا کا اشراقی نظریہ کہہ سکتے ہیں، بہشت کے مستحقین یہ چند گنے چنے انسان تھے، یہاں بھیڑ

بھاڑ کا احتمال ہی نہ تھا، البتہ ابدیت جہنم کی بھیڑ بھاڑ کو نظرانداز کر دیجئے،

اب آپ مغربی دنیا کے اس کمیتی نقطۂ نگاہ کو دیکھئے، جو حال میں سب پر چھا گیا تھا،

نظریۂ ارتقاء کے مطابق ہمیں اپنے ذہن میں کونوی عمل کے لئے مکان و زمان و انواع کے ایسے

وسیع پیمانہ کا تصور کرنا پڑتا ہے، جو ہمارے اسلاف کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا ہم

دیکھتے ہیں کہ انسان کی تاریخ بتدریج حیوان سے نکلتی ہے، اور یہ تاریخ حیوانی ارضیات کے

دور ثالث[1] سے جا ملتی ہے، اس ارتقائی طریق خیال نے آہستہ آہستہ ایک جمہوری نظریۂ بقا

پیدا کر دیا ہے، جو پچھلے اشراقی نظریہ سے مختلف ہے، جہاں اس ارتقائی ذہنیت نے ہمیں بعض

باتوں میں قدرے بدبین بنا دیا ہے، وہاں بعض اور باتوں میں اس نے ہمیں ہمدردی کی صفت

بھی عطا کی ہے، ہم سوچتے ہیں کہ ہمارے یہ نیم وحشی اور قدیم بھائی جن کا نظریۂ ارتقاء ذکر کرتا

ہے، ہمارے ہی گوشت و پوست سے اور ہمارے ہی خون سے بنے تھے، فطرت کا یہ حیر تکدہ

اپنی ظلمت میں انھیں بھی اسی طرح گھیرے ہوے تھا، جیسے کہ وہ ہمیں گھیرے ہوئے ہے،

کبھی ان سے بھی سنگین جرائم کا ارتکاب ہوتا تھا، اور کبھی وہ اپنے ہی جوش جنون کے شکار ہوتے

تھے، جہالت کی بدترین ظلمت میں ان کی گذر ہوتی تھی، اور ان کے دل طرح طرح کے خوفناک

اور مکروہ اوہام سے پُر ہوتے تھے، لیکن نور کی ایک کرن اور روشنی کا ایک شعلہ ان کے دلوں

کو ہر وقت منور کرتا رہتا تھا، ان کے دل میں ہر وقت یہ یقین تھا کہ زندگی خواہ کیسی بھی ہو موت

سے بہتر ہے، اس ایمان کی بدولت وہ زندگی کی مشعل کو تباہی کے دائمی تند جھونکوں سے بچاتے

---

[1] دور ثالث سے مراد تکوین ارض کا وہ زمانہ ہے، جس میں بڑے بڑے پہاڑوں مثلاً ہمالہ کی داغ بیل پڑی، جانوروں کی موجودہ انواع کا ارتقاء بھی اسی دور میں ہوا،

تھے انھی کی کوششوں کی بدولت یہ مشعل آج ہمارے لئے شمع راہ بنی ہوئی ہے، جب ہم ان

قدیم اور نیم وحشی انسانوں کا جو جہالت کے اس ہمت آزما بوجھ کو اٹھائے ہوئے زندگی کی منزلیں طے

کر گئے، اپنے ذہن میں تصور کرتے ہیں، تو ہمیں اپنی شخصی فضیلتیں کس قدر بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں

اور پھر خدا کی نظروں میں کسی شخص واحد کی ذاتی فضیلت کے ایک دو ذرے کس قدر بے ضرورت

معلوم ہوں گے جب اس فضیلت کو نوع انسانی کی اس عام فضیلت کے مقابل میں رکھا جائے

کہ خاموشی اور شجاعت سے اٹھتے بیٹھتے، یہ نوع اپنا بنیادی فرض ادا کر رہی ہے، اور شجاعانہ

زندگی بسر کر رہی ہے جب ہم اس پر شکوہ اور ہیبت ناک منظر کا ذہن میں تصور کرتے ہیں، تو

انکسار کا جذبہ ہمیں جھکا دیتا ہے، ہم سوچتے ہیں، کہ پروردگار عالم کی نظروں میں ہمارے باہمی

اختلافات اور ہمارے ذاتی فضائل اس قدر پسندیدہ نہیں ہیں، جس قدر کہ ہماری یہ عام حیوانی

خاصیت پسند ہے یعنی ابتلا میں صبر اور کوشش پیہم اس خیال سے ہمارے دل ہمدردی اور

برادرانہ شفقت کے جذبات سے پر ہو جاتے ہیں، ہم سوچتے ہیں، کہ اُس بقا کا کیا فائدہ جس

میں اَن گنت لوگوں کے لئے جگہ نہ ہو جو اسی طرح کوشاں رہے، جیسے کہ ہم ہیں، ہماری

طبیعت اس بات کے خیال ہی سے متنفر ہو جاتی ہے، کہ ہماری ذاتی شایستگی، اور ہماری بلند ہمتی

فضیلت ہمیں اپنے ان بھائیوں سے (جو خوان حیات میں ہمارے برابر کے شریک تھے)

اس قدر برتر کر دے، کہ ہمارے لئے تو ابدی رحمت کے دروازے کھل جائیں، اور ان کے لئے

یا تو جہنم کی ابدی زحمت رہ جائے، اور یا عام جانوروں کی طرح موت ان کا کلی اور مستقل خاتمہ

کر دے، دل تو ایک قدم اور آگے بڑھنا چاہتا ہے، جانور کیوں موت کے بعد ختم ہو جائیں، ؟ کیا

خود وحوش کی زندگی شجاعانہ زندگی نہیں ہے، ؟ اسی طرح زمانہ حال کے انسان کا دل یعنی

وہ دل جو نظریۂ ارتقاء کے پیدا کردہ جذبۂ کونوی سے پُر ہے، حیوانوں کو بھی بقا سے محروم کرنا نہیں

چاہتا، بلکہ یہ پوچھتا ہے، کہ اگر کسی ایک ہستی کے لئے بقا ہے، تو پھر سب کے لئے کیوں نہیں،
ان صابر و حوش کے لئے کیوں نہیں، ؟ مختصر یہ ہے کہ اگر آپ بقا چاہتے ہیں، تو بقا کا یہ پیمانہ
اس قدر وسیع نظر آتا ہے، کہ ہماری قوتِ متخیلہ اس کے تصور سے گھبرا جاتی ہے، اور ہمارے
ذاتی احساسات شل ہو کر رہ جاتے ہیں، ہم سوچتے ہیں کہ بقا کا یہ منظر اس قدر وسیع ہے، کہ ہم اسے
تسلیم کر نہیں سکتے، اسلئے بہتر یہ ہے کہ ہم خود اپنی بقا کا خیال بھی ترک کر دیں، کیونکہ اسی خیال
کی وجہ سے ہمیں یہ وسیع منظر ذہن میں لانا پڑا، چنانچہ ہم اپنے لئے بقا کی خواہش تک کو ترک
کر دیتے ہیں، لیکن اس بات کے لئے تیار نہیں ہیں، کہ افریقہ اور آسٹریلیا کے جس قدر وحشی انسان
آج تک ہوئے ہیں، ان کو بھی اپنا شریک بقا کریں، ذہن کہتا ہے کہ حیات بہت اچھی شے ہے، اگر اس
کی وسعت معقول ہو، لیکن جب ہم نے دنیا بھر کو شریک بقا کر لیا، تو آسمان و زمین کی ساری وسعت
اس لامحدود اور ہر دم بڑھتے ہوئے سیلاب کو سمیٹ نہ سکے گی،

موجودہ سائنس سے چونکہ میں بھی متاثر ہوا ہوں، اور یہ کیفیت جس کا میں نے ابھی ذکر کیا
ہے، مجھ پر بھی گذر چکی ہے، اسلئے میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ آپ میں سے بہت صاحبوں پر بھی یہی
حالت گذری ہو گی، لیکن میں نے یہ بھی جان لیا ہے کہ یہ خیالات از سر تا پا غلط ہیں، اس مغالطہ
کی دریافت نے میرے ذہن کو نئے سرے سے آزادی بخشی ہے، اور میں سوچتا ہوں کہ ایک
خدمت جو اس وقت میں آپ حضرات کی کر سکتا ہوں، یہ ہے، کہ آپ کو بھی بتا دوں کہ مغالطہ
چھپا کہاں ہے،

یہ مغالطہ اس قدر کھلا ہوا ہے کہ لوگوں کے اُسے نہ جان لینے پر حیرت ہوتی ہے، یہ مغالطہ
نتیجہ ہے اس تباہ کن کورچشمی کا جس میں ہم سب مبتلا ہیں، ہم لوگ دوسروں کی زندگی کی اندرونی
اہمیت سے بالکل بے حس اور ناواقف ہیں، ایک تو یہ ناواقفیت، پھر یہ تعصب کہ ہم اپنی کورچشمی کو

اس وسیع نظام عالم کا پیمانہ بناتے ہیں، اور اپنی بے حقیقت ضرورتوں کو ہستی مطلق کی ضروریات کا
معیار سمجھتے ہیں، ہمارے عیسائی اسلاف اپنے نقطۂ نگاہ سے اس مسئلہ کو ہم سے زیادہ آسانی سے حل کر
لیتے تھے، ہمارا نقص یہ ہے کہ ہم میں ہمدردی پوری طرح موجزن نہیں ہے، ان کی حالت اس کے
برعکس تھی، انھیں ہر اس انسان سے نفرت تھی، جو ان کے محدود حلقہ میں شامل نہ تھا، اور وہ
اپنی سادگی سے یہ سمجھتے تھے، کہ جس طرح انھیں غیر عیسائی لوگوں سے نفرت ہے، اسی طرح
خدا کو بھی ان سے نفرت ہے، وہ ان کے خیال میں کافر تھے، اسلئے ہمارے اسلاف اس خیال
سے خوش ہوتے تھے، کہ ان سب کو اللہ میاں نے جہنم کی آگ کا ایندھن بنانے کے لئے پیدا
کیا، ہماری تہذیب ہمیں ایسے عقیدے کی اجازت نہیں دیتی، لیکن ہم اس کے لئے بھی تیار نہیں
ہیں، کہ انھیں فردوس کے خوانِ نعمت مین اپنا شریک بنائیں، ہم اپنے خیال میں کہتے ہیں
کہ ہمارا ان سے کیا سروکار؟ پھر ہم سوچتے ہیں کہ اگر سروکار نہیں تو وہ بقا کیوں پائیں، ؟ مثلاً چینیوں
کے متعلق اپنے ذہن کا جائزہ لیجئے، کیا آپ میں سے کسی صاحب کو بھی یہ خیال بھلا معلوم ہوتا
ہے، کہ یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح تعداد میں بڑھتے چلے جائیں، ؟ غالباً ایک صاحب
بھی ایسے نہ ہوں گے، زیادہ سے زیادہ آپ یہ فرمائیں گے، کہ یہ قوم بہت عجیب و غریب ہے
اسلئے آٹھ دس نمونے باقی رکھ لو، ان کے علاوہ جو کروروں چینی موجود ہیں، اور جن کے متعلق
آپ نے ایک عام ذہنی تصور یعنی چینی قائم کر رکھا ہے، وہ فرداً فرداً آپ کی نظروں میں ہیچ ہیں
یا نہیں، ؟ آپ کا ذہن کہتا ہے، کہ خود خدا کو بھی اتنے چینیوں کی کیا ضرورت ہے، ؟ ہر ایک چینی
کو ابدیت بخشنا (آپ کے خیال میں) خواہ مخواہ خدا کو اور دنیا کو تنگ کرنا ہے، اس طرح مسئلہ
بقا آپ کے ذہن میں کچھ دردِ سر اور کچھ روحانی متلی پیدا کر دیتا ہے، چنانچہ پہلے تو آپ کو شک ہوتا ہے
کہ یہ سب لوگ بقا کیسے پا سکتے ہیں، اور پھر آپ کو خود اپنی بقا پر بھی شک گذرتا ہے، حالانکہ

آپ کا دل قدم قدم پر آپ کو خود اپنی بقا کی اہمیت اور ضرورت سمجھا رہا ہے، مجھے یقین ہے کہ جو صاحب اس وقت میرے سامنے بیٹھے ہیں، ان میں سے بہتوں کا یہی حال ہے،

لیکن کیا آپ نے اس بات پر بھی غور کیا کہ یہ طرز استدلال آپ کی اپنی قوت تخیلہ کی کوتاہی اور نقص کو ظاہر کر رہا ہے، آپ اجنبی انسانوں کے ان گروہوں کو اس حیثیت میں لے رہے ہیں، جس حیثیت سے وہ آپ کے سامنے آتے ہیں، یعنی آپ کی آنکھوں کے پردہ بشکی پر ایک خارجی تصویر کی حیثیت سے، یہ تصویر اپنی وسعت اور بے ترتیبی کی وجہ سے آپ کو گھبرا دیتی ہے، آپ استدلال کرتے ہیں، کہ جو کیفیت ان لوگوں کی میری نظر میں ہے، وہی کیفیت اور حالت ان کی اپنی اصلی حالت ہے، اور چونکہ مجھے ان لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں، اسلئے درحقیقت (کسی کو بھی) ان کی ضرورت نہیں، لیکن جس طرح آپ خارجی حیثیت سے ان سے آگاہ ہیں، اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ شدت سے وہ اپنی حیات کی اندرونی آگہی اپنے اندر پاتے ہیں، وہ مردہ اور ہیچ نہیں ہیں، آپ ہیچ اور مردہ اور کور چشم ہیں، کہ اس غلط طریقہ سے آپ ان کا تصور کرتے ہیں، آپ کی آنکھیں ایک ایسے منظر پر کھلتی ہیں، جس کے مفہوم سے آپ قطعاً ناواقف ہیں، آپ اپنے دل میں لذت حیات و زیست کی تابش پاتے ہین، یاد رکھئے کہ وہی تابش اسی تیزی اور سوز سے، بلکہ اس سے زیادہ گرمی اور زیادہ شدت سے ان اجنبی اور مکروہ صورتوں کے دلون میں بھی موجزن ہے، اور اس اجنبی کے لئے بھی خورشید طلوع ہوتا ہے، اور حسن اپنی کرنوں سے اس کا راستہ صاف کرتا ہے، اسٹیونسن[1] نے سچ کہا ہے، کہ اگر آپ میں اس اجنبی کے ذوق اندرون کا احساس نہیں ہے، تو آپ نے اُسے بالکل نہیں سمجھا، اس ان گنت گروہ میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے، جس کے دل و شعور میں بقا کی خواہش پوری تیزی سے شعلہ زن نہ ہو،

[1] The Lantern Bearers by R L. Stevenson

یہ خیال کہ آپ کو اس شعلہ کا یا اس کی ضرورت اور اہمیت کا احساس نہیں ہے، بالکل غیر متعلق ہے اگر آپ کی دلچسپی کسی خاص مقام پر پہونچکر بالکل خاموش اور سرد پڑ جاتی ہے، تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا، کہ اور دلچسپیاں سرے سے ہی نہیں ہیں، نظام عالم جب اپنے وسیع خزانوں سے کوئی زندہ ہستی پیدا کرتا ہے، تو ساتھ ہی اس ہستی کے بقا کی ضرورت اور اس بقا کی خواہش بھی پیدا کر دیتا ہے، اگر کسی دوسرے کو اس خواہش اور ضرورت کا احساس نہ ہو، تو نہ ہو، لیکن خود اس زندہ ہستی کو ضرور ہوگا، اسلئے اگر ہم میں سے کسی شخص کے دل میں دوسرے جانداروں کے ساتھ ہمدردانہ جذبہ کا احساس جلد ختم ہو گیا ہے، تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مطلق اور لامحدود ہستی کے دل کے اندر بھی یہ احساس موجود نہیں ہے، عجب مضحکہ انگیز ہوگا، آپ اپنے ذہن سے یہ خیال نکال دیجئے، کہ عالم کائنات ایک محدود مکان ہے، اور جتنی مخلوق اس کے اندر آتی جائے گی، اسی تناسب سے مکان کی وسعت تنگ ہوتی جائے گی، یہ خیال غلط ہے، جو ذہن پیدا ہوتا ہے، وہ اپنا مکان و محل اپنے ساتھ لیکر آتا ہے، اور ذہن و مکان اور محل کی یہ فراوانی مخلوق کے لئے جگہ تنگ نہین کرتی، کیا میرے تخیل کا مکان، آپکے تخیل کے مکان کا نقیض ہے؟ ہرگز نہیں، شعور کے امکان کی کوئی حد نہیں، اور نہ اس عالم شعور میں کوئی ایسا قانون عمل پیرا ہے جیسا کہ تحفظ قوت[1] کا مشہور قانون مادی دنیا میں جاری سمجھا جاتا ہے، جب ایک انسان پیدا ہوتا ہے

[1] یہ طبعیات جدید کا ایک مشہور قانون ہے کہ جب کاغذ کے ٹکڑے کو آپ جلا دیتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو قوت یا Energy اس ٹکڑے میں موجود تھی، وہ ضائع ہو گئی؟ طبیعی کہتا ہے کہ کوئی قوت ضائع نہیں ہوئی، صرف شکل و حالت بدلتی ہے، اس کاغذ کی قوت نئی صورتیں پا گئی ہے مثلاً جلنے سے روشنی گرمی اور دھوان ظاہر ہوا اور کچھ راکھ رہ گئی، کاغذ کی قوت ان اشیا میں منتقل ہو گئی، مادی دنیا کی قوت نہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی، یہ ہے قانون تحفظ، (مترجم)

یاجاگ اٹھتا ہے، تو یہ ضروری نہیں ہے کہ کائنات کی شعوری مقدار کا توازن قائم رکھنے کیلئے
کوئی دوسرا انسان سوجائے یا مرجائے، پروفیسر وونڈٹ[1] نے تو اس کے برعکس اپنی کتاب نظام
فلسفہ میں ایک قانون پیش کیا ہے، جسے وہ قانون ترقی قوت روحانی کا نام دیتے ہیں، اس
قانون کو وہ مادی دنیا کے قانون تحفظ قوت کا مقابل سمجھتے ہیں، روحانی معاملات میں ہستی کی
ترقی کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، جب کوئی روحانی ہستی پیدا ہوتی ہے، تو وہ اپنا اثبات واقرار
کرتی ہے، پھلتی پھولتی ہے، اور اپنی بقا چاہتی ہے، اس لئے ہم یہ کہنے کے مجاز ہیں، (اور ہمیں
اپنی ذاتی ہمدردی کے نقص کو نظر انداز کر دینا چاہئے) کہ نظام عالم میں حیات افراد کی رسد (خواہ
یہ رسد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو) کبھی ضرورت سے زیادہ نہیں ہوسکتی، جب ایک ہستی پیدا ہوتی
ہے، تو اس کی ضرورت اس کے ساتھ پیدا ہوجاتی ہے، یعنی جو پیدا ہوتا ہے، وہ اپنی بقا کی
ضرورت کو اپنے ساتھ لاتا ہے،

آپ نے سمجھ لیا ہوگا، کہ میں اس وقت ان تمام ہستیوں کی طرف سے وکالت کر رہا ہوں،
جو ہیں تو مجھ سے مختلف لیکن میری طرح اپنے اندر حیات کا جوش وخروش موجزن رکھتی
ہیں، اگر ہمارا مذہب وحدت[2] وجود کا مذہب ہے، تو ہم یہیں ٹھہر سکتے ہیں، اور یہ کہہ کر قصہ
ختم کر سکتے ہیں، کہ کائنات کی ازلی اور ابدی روح ان مختلف ہستیوں کے ذریعہ سے اپنی ہی
ابدیت کا اقرار واثبات کر رہی[3] ہے، لیکن اگر ہمارا مذہب الوہیت کا مذہب[4] ہے، تو ہم اپنے

[1] W. wundt, a System of Philosophy

[2] یعنی "ہمہ اوست" کا مذہب، [3] یہ خیال بالکل ایسا ہے، جیسا کہ اس مشہور حدیث میں ہے کنت کنزاً مخفیاً (یعنی خدا فرماتا ہے میں چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے ظاہر ہونا پسند کیا، اسلئے خلقت کو پیدا کیا) معارف: یہ حدیث موضوع ہے، [4] یعنی یہ عقیدہ کہ خدا موجود ہے، اور اسکی طرف سے بندوں کی ہدایت

نتیجہ کو بدلے بغیر آگے بڑھ سکتے ہیں، ہم کہہ سکتے ہیں، کہ خدا کی رحمت کا خزانہ اس قدر لاانتہا ہے کہ
اُسے اس کی خواہش اور ضرورت ہے کہ مخلوق کا ایک نہ ختم ہونے والا دریا ہر وقت جاری رکھے، اس
ہر لمحہ بڑھنے والے دریا کی سیرابی سے وہ (ہماری طرح) نہ تھک سکتا ہے، اور نہ اکتا سکتا ہے، ہر کام
میں اس کا پیمانہ غیر محدود ہے، اس کا جذبۂ رحمت اپنی ہمہ گیری میں کبھی سیر نہیں ہوتا،

مجھے امید ہے کہ اب آپ میرے ساتھ اس امر میں متفق ہوں گے، کہ فردوس کی بھیڑ
بھاڑ کا کھٹکا دینے والا تصور حقیقت پر مبنی نہیں ہے، بلکہ وہ محض ہمارا ایک شخصی اور ذاتی مغالطہ
ہے، جس کی علت انسان کی اپنی تنگ نظری ہے، یہ تنگ نظری اس تنگ دل اشراقی نظریۂ
بقا سے پیدا ہوتی ہے، جس کا اوپر ذکر ہوچکا ہے، میرے دوستو اپنے پروردگار کے سامنے
جھک جاؤ، اور اپنی نظر کو اس کے اس شاہانہ جلال کی طرف اٹھاؤ، جو آسمان کے تاروں میں
نمودار ہے، پھر تم دیکھ لوگے، کہ یہ عالم ایک جمہوری عالم ہے، اپنی تنگ دلی اور کم ظرفی کو آپ
کائنات کا پیمانہ نہ بناؤ، جب پروردگار نے اس کرۂ ارض کو بسایا تھا، تو کیا آپ کی رضامندی
کا پروانہ حاصل کیا تھا،؟ اگر نہیں تو حیات بعد الموت کی وسیع مملکت کی آبادی کیلئے اُسے آپ کی
پسندیدگی کا اجازت نامہ حاصل کرنا کیوں ضروری ہے،؟ (حضرت) ایوب (علیہ السلام) کی طرح
اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیجئے، اور شکر کیجئے کہ با ایں ہمہ کم مائگی آپ کو بھی اس وسیع ملک میں بسنے
کی اجازت مل گئی ہے، جو پروردگار ہم کو اور آپ کو اس میں بسنے کی اجازت دیتا ہے، وہ اور ہستیوں
کو بھی دے سکتا ہے، خواہ ہم اپنی جگہ پر ان ہستیوں کو کتنی ہی عجیب وغریب ومکروہ تصور کریں،

الغرض جہاں تک منطقیانہ ربط واستدلال کا تعلق ہے، میں بالکل اسکے لئے تیار ہوں
کہ اس دنیا کے جگنوؤں کا ہر ستہ جو ہوا میں اڑتا اور گرتا ہے، بقا پاجائے، اب سوال صرف یہ ہے کہ،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۸) کیلئے وحی نازل ہوتی ہے، الوہیت میں یہودیت، نصرانیت اور اسلام شامل ہیں، (مترجم)

امر واقعہ کیا ہے، ؟ کیا پتے کو بقا مل سکتی ہے، یا نہیں ؟ ایسے فرضی اعتراضات کہ اس سے تعداد بہت بڑھ جائے گی یا اس عالم حادث کو موت کے بعد اسی طرح دوبارہ پیدا کرنے یا جاری رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ درحقیقت غیر متعلق ہیں، کمیت کی کمی بیشی یا قبل موت، اور بعد موت کی دنیا کی مخلوق کی نوعی ہم آہنگی، یہ محض حالتیں ہیں ہمارے اپنے محدود طرز فکر کی، اگر ہم اس فکر سے قطع نظر کرکے دیکھیں، تو عالم کی وسعت کا ایک پیمانہ کسی دوسری قسم کے پیمانہ سے ذرہ برابر بھی زیادہ بعید از فہم یا معجزانہ نہیں ہے، ہستی اسی طرح ممکن ہے، جس طرح کہ نیستی جب ایک بار ہستی معرض وجود میں آئی، تو اس کا پیمانہ بھی (خواہ وہ کسی قسم کا ہو) ممکن ہوگیا،

ہستی کا دل ایسا کم ظرف نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے قلب محدود ہیں، ہمارا ادراک اور ہماری ہمدردی ان زندہ ہستیوں کی اندرونی اہمیت کا اندازہ کر نہیں سکتی، جو ہم سے مختلف ہیں اگر ہم اپنی اندرونی (روحانی) زندگی کی ایسی اہمیت پاتے ہیں، جس سے معًا ہمارے دل میں اپنی بقا کے استحقاق کا خیال پیدا ہوتا ہے، تو رواداری کا تقاضا یہ ہے کہ دوسری ہستیوں کی خواہش بقا کو بھی ہم ویسی ہی اہمیت دیں، خواہ یہ ہستیاں ہماری نظروں میں کتنی ہی کثیر التعداد اور ناپسندیدہ کیوں نہ ہوں، اگر ہم دوسروں کی بقا کی اہمیت کے تصور سے بالکل ہی معذور ہیں، یا ان کے بقا کو ناقابل اعتنا سمجھتے ہیں، تو کم از کم ہمیں اپنی بقا کے تصور و خواہش سے دست بردار نہ ہوجانا چاہئے، اگر ہم نے ایسا کیا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا، کہ ہماری کورچشمی نے بصیرت پر غاصبانہ قبضہ کرلیا ہے۔

نٹشے

مشہور جرمن فلاسفر فریڈریک نٹشے کی سوانحعمری اور اسکے افکار و خیالات، اور تصانیف پر بحث و تبصرہ ہے، مصنفہ پروفیسر مظفر الدین ندوی ایم اے، حجم ۱۰۲ صفحے قیمت ۱۲ر

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

تاریخ کی بین الاقوامی کانگریس

اس سال تاریخ کی بین الاقوامی کانگریس کا آٹھواں اجلاس گذشتہ اگست اور ستمبر میں زیورچ میں منعقد ہوا، اسمیں پچپن مختلف قوموں کے ۱۲۰۰ مورخین جمع ہوئے تھے، ہندوستان کی طرف سے پادری ہراس پرنسپل سینٹ زیویر کالج بمبئی، اور پروفیسر ہارون خان شیروانی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سرکاری نمایندے تھے، مشرقی اور اسلامی ممالک میں سے افغانستان، البانیہ، الجیریا، چین، مصر، ایران، فلسطین، شام، اور ترکی کے نمایندے آئے تھے، الجیریا کی نمایندگی فرانسیسیوں نے کی، افغانستان کی طرف سے مجلس اقوام کے افغانی نمایندہ نے شرکت کی، شام سے ہز اکسلنسی امیر شکیب ارسلان تھے، فلسطین کی جانب سے یہودیوں کی یونیورسٹی کا ایک پروفیسر شریک ہوا، ترکی کے نمایندے ڈاکٹر فواد کوپرلی اور ڈاکٹر حامد زبیر کوسے تھے، اول الذکر انگورہ میں تاریخ کے پروفیسر اور آخر الذکر میوزیم کے ڈائرکٹر جنرل ہیں، ہندوستان سے مذکورۂ بالا دو سرکاری نمایندوں کے علاوہ کلکتہ یونیورسٹی، برالمہ ریسرچ سوسائٹی بمبئی اور پنجاب یونیورسٹی کے نمایندے بھی شریک تھے،

کانگریس مختلف شعبوں پر مشتمل تھی، مشرقی شعبوں کے ارکان میں فادر ہراس اور پروفیسر شیروانی بھی تھے، پروفیسر شیروانی نے ایک مہینہ پیشتر یہ تجویز بھیجی تھی، کہ اسلام کے تمدنی اثرات کو مغرب کے مورخوں نے نظر انداز کر رکھا ہے، اسلئے اس کانگریس کو اسکی طرف خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے

اس تجویز پر غور کرنے کیلئے مشرقی شعبہ کا ایک جلسہ کانگریس کے کھلے اجلاس سے ایک روز پہلے منعقد ہوا، اس میں کانگریس کے صدر ڈاکٹر ٹمپرلی کے علاوہ انگلستان، چین، جرمنی اور ہیڈرلینڈ کے نمایندے بھی شریک تھے، پروفیسر شیروانی کی تجویز اور اسلامی کلچر کی اہمیت پر دیر تک بحث ہوتی رہی آخر میں متفقہ طور پر طے پایا کہ آیندہ کانگریس میں ہندوستان اور مشرق میں جو اسلامی اثرات پیدا ہوئے ہیں، ان کے لئے ایک شعبہ کا اضافہ کیا جائے، اور مشرقی زبانوں کی کتابیں کانگریس کی کتابیات میں لاطینی حروف میں شامل کریجائیں،

۲۸ اگست کو ڈاکٹر ٹمپرلی (کیمبرج یونیورسٹی) کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس شروع ہوا، کانگریس کی سرکاری زبانیں فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور انگریزی ہیں، ان ہی چار زبانوں میں تقریریں ہوئیں، اور مقالات پڑھے گئے، مقالات کی تعداد ۲۰۵ تھی، اسلامیات اور مشرقیات سے متعلق مندرجۂ ذیل مضامین پڑھے گئے،

۱۔ بازلی کا فری جیائی شہر از ڈاکٹر زبیر کوسے (انگورہ) فرانسیسی زبان میں،

۲۔ صلیبی جنگ کے زمانہ میں شام میں مغربی یورپ کی قوموں کی ریاست (Frankish Seigniory) کا زوال از پروفیسر لامانتے (سن سانتی) انگریزی زبان میں،

۳۔ صلاح الدین اعظم کی سیرت" از امیر شکیب ارسلان (شام) فرانسیسی زبان میں،

۴۔ "سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کی تاریخی اہمیت" از ڈاکٹر، اے، اچ، لی، بیر (اربانا) انگریزی زبان میں،

۵۔ "چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ اور مشرقی سوال" از ڈاکٹر جے ڈابرو واکی (کراکو) جرمن زبان میں

۶۔ "ازمنۂ وسطی میں ترکی اسلامی جاگیرداری" از ڈاکٹر فواد کوپرلی (انگورہ) فرانسیسی زبان میں

(۷) "بحر روم کے مسائل، ولیم ثالث سے ۱۹۱۴ء تک" از پروفیسر پی سلوا، (روم) اطالوی زبان میں،

۸۔ "انیسوی صدی عیسوی میں بحر روم" از ڈاکٹر وائی، ام، گویلے، (پیرس) فرانسیسی زبان میں،

۹۔ "تجدید عیسائیت کی مخالفت کے زمانہ میں ترکی کے مسائل" از ڈاکٹر ماٹوسک (پریگ) فرانسیسی زبان میں

۱۰۔ "پارسٹن سے ڈس رائیلی کے زمانہ تک انگلستان اور ترکی کی آزادی" از ڈاکٹر اچ ٹمپرلی، (کیمبرج) انگریزی زبان میں،

۱۱۔ "انقلاب فرانس اور یونانیوں کی آزادی" از ڈاکٹر ڈاس کالاکس (ایتھنس)

۱۲۔ "والاچیا اور مولڈیویا، کے دیوان (وزیر) کے انتخاب (۱۸۲۹-۹۴ء) میں دوسری قوموں کا حصۃ" از پروفیسر اوٹے ٹی (جیسی) فرانسیسی زبان مین،

۱۳۔ "کمبوڈیا میں ہندوستانی مندر کا ایک کمیاب طرز" از ڈاکٹر گھوشال (کلکتہ) انگریزی زبان میں،

۱۴۔ "موریا خاندان کے ماتحت سلطنت ختن" از پروفیسر اچ، سی سیٹھ، (ناگپور) انگریزی زبان میں،

۱۵۔ "سندھ کے تالپور فرمانرواؤن کے زمانہ میں جرم اور سزا" از مسٹر اے، بی، ادوانی (کراچی) [illegible]یزی زبان میں،

۱۶۔ "یونا تور کی داستان موہنجوداڑو کے کتبوں کی روشنی میں" از فادر ہراس (بمبئی) انگریزی زبان میں،

۱۷۔ "مشرقی عیسویت اس کا طرز زندگی اور عمل اور اسکے مقابلہ میں اسلام اور مذہب مانی"، از پروفیسر گوئڈی (روم) اطالوی زبان میں،

۱۸۔ "اسلامی سیاسی خیالات اور پولیٹیکل سائنس میں اسکی اہمیت" از پروفیسر ہارون خان شیروانی (عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد) انگریزی زبان میں،

۱۹۔ "اٹھارہویں صدی عیسوی میں موریا کی آبادی" از پروفیسر جون لپاس (کلج) فرانسیسی زبان میں،

ہر مقالہ کے خاتمہ پر بحث ہوتی تھی، جس میں نقد و تبصرہ اور سوال و جواب کی پوری آزادی تھی، اس کانگریس کا آئندہ اجلاس ۱۹۴۳ء میں روم میں ڈاکٹر لالینڈ (واشنگٹن ممالک متحدہ) کی صدارت میں ہوگا،

(اسلامک کلچر) "ص ع"

تقریر کی تیاری

تقریر کی تیاری میں حسب ذیل چیزوں کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے، ان سے فائدہ اٹھا کر مقرر اپنی قابلیت اور موثر آواز سے تقریر کو بہت کامیاب بنا سکتا ہے، اور اسے نظر انداز کر دینے سے تقریر ناکام رہتی ہے،

۱۔ تقریر تیار کرتے وقت مقرر کو اپنے آپ کو سامعین میں کا ایک فرد سمجھنا چاہئے، جب وہ کسی موضوع پر بولے، تو یہ کبھی تصور نہ کرے کہ حاضرین اس کے موضوع سے اسی کی طرح دلچسپی رکھتے ہیں، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سامعین میں سے بہت سے اشخاص تقریر کے موضوع سے بالکل ناواقف اور نابلد ہوتے ہیں، اسلئے مقرر کو اپنے مضمون کو بہت ہی دلچسپ پیرایہ میں پیش کرنا چاہئے، تاکہ حاضرین کم سے کم یہ محسوس کریں کہ جلسہ میں انکی شرکت رائگاں نہیں گئی، اس

کے لئے حاضرین کے ذہن کا اندازہ لگانا ضروری ہے، ان میں بعض اشخاص ایسے ہوتے ہیں، جو دن بھر کی مشغولیتوں سے تھکے ماندے ہوتے ہیں، بعض گھریلو زندگی کے تردد و فکر سے پراگندہ خاطر ہوتے ہیں، اور بعض بے کاری اور کاہلی کے باعث دماغی حیثیت سے معطل اور جامد رہتے ہیں، ایک مقرر کے لئے ان تمام ذہنی کیفیتوں کا تجربہ کرنا اور ان کو سامنے رکھنا ضرور ہے تاکہ وہ اپنی تقریر میں ہی تنوع پیدا کر کے ہر قسم کے اشخاص کو مطمئن کر سکے، تقریر کو دلچسپ بنانے کے لئے تنوع بہت ضروری جزو ہے،

۲۔ تقریر کرتے وقت تقریر کے مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے، اکثر مقرر اس لئے ناکام رہتے ہیں، کہ ان کی تقریر کے ختم ہونے کے بعد حاضرین کو سوچنا پڑتا ہے، کہ ان کی تقریر کا مدعا کیا تھا، جب تک تقریر کا کوئی مقصد نہیں ہوتا، اس وقت تک مقرر کے خیالات میں ترتیب اور اسکے اظہار میں اثر ہونے نہیں پاتا، مقرر جتنے رموز و نکات بھی بیان کرنا چاہے، ان کو بتدریج ایک خاص مقصد کے ماتحت بیان کرنا چاہئے، وہ اپنی تقریر میں خواہ کچھ بھی کہے لیکن اس سے تقریر کا مقصد عیاں اور ظاہر ہوتا رہے، ڈسرائلی کا قول ہے کہ کامیابی کا راز مقصد کی استقامت ہی میں ہے، تقریر بھی بغیر مقصد کے بالکل ناکام ہے،

۳۔ تقریر کا آغاز ہمیشہ دلچسپ ہونا چاہئے، ابتدا ہی میں رنج، افسوس، غم اور ملال کے اظہار سے حاضرین کے جذبات پژمردہ ہو جاتے ہیں، اس کے بعد مقرر کی شگفتہ بیانی مشکل سے کوئی اثر پیدا کر سکتی ہے، ایک مقرر کو جب یہ معلوم ہو جائے، کہ جلسہ کی فضا اس کے موافق نہیں ہے، اور حاضرین اسکی باتوں کو قبول اور تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں، تو اس کو تقریر کی ابتدا بہت ہی خوشگوار اور لطیف پیرایہ میں کرنی چاہئے، یا جب وہ پرجوش اور پرکیف تقریر کے ذریعہ سے حاضرین کے جذبات کو منتہائے کمال تک پہونچانا چاہے، تو اسکو ابتدا ہی سے اپنے اور حاضرین کے درمیان

ہمدردانہ اور محبت آمیز ربط اور تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے،

۴۔ تقریر میں سادگی اور اخلاص کا پہلو زیادہ نمایاں ہونا چاہیے، مقرر کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حاضرین اس کے موضوع سے بالکل ناآشنا ہیں، اس سے تقریر کے الفاظ بالکل سادہ اور اصطلاحات بہت ہی آسان ہونے چاہئیں، تاکہ حاضرین کو سمجھنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو، خیالات کیسے ہی ادق، مشکل، نازک اور باریک ہوں، اگر ان کو سادہ اور آسان الفاظ میں پیش کیا جائے تو تقریر زیادہ موثر اور کامیاب ہو سکتی ہے، خیالات خواہ مشکل اور پیچیدہ ہوں، لیکن الفاظ مغلق اور پریشان کن نہ ہوں،

ایک مقرر کو الفاظ اور اصطلاحات کی سادگی پر اسی وقت قابو ہو سکتا ہے جب وہ اپنے موضوع پر غیر معمولی طریقہ سے تیار ہو، جب تک موضوع پر پوری تیاری نہ ہو، جلسہ میں آکر بولنا مناسب نہیں، اور جب وہ تیار ہو جائے تو جلسہ میں سیدھا کھڑا ہو کر بولتے وقت سر کو اونچا رکھے، جو کچھ کہنا چاہتا ہو صاف آواز میں کہے، زیادہ نہ چلائے اور نہ اپنے ہاتھ کو حرکت دے، اور جو کچھ کہے اس میں اخلاص کی بو ہو، حاضرین کو جب تک یہ محسوس نہ ہوگا کہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اس کے دل کی آواز ہے، اس وقت تک اسکی تقریر کامیاب اور اس کا پیام موثر نہ ہوگا،

۵۔ تقریر کے حقائق کی وضاحت اور واقعات کی خشکی دور کرنیکے لئے مثالیں اور قصے بہت ہی معاون ثابت ہوتے ہیں، اسلئے تقریر میں ان کا حوالہ بھی ضروری ہے، ذاتی تجربے اور مشاہدے کی مثالیں اور قصے زیادہ موثر ہوں گے، مگر کوئی مثال یا قصہ نفس موضوع سے دور اور الگ نہ ہونے پائے،

۶۔ تقریر محض تقریر کرنیکی خاطر نہیں کرنی چاہیے، جب تک کوئی بات واقعی کہنے کی نہ ہو اسوقت تک نہ کی جائے، محض اپنی آواز سنانے کیلئے تقریر کرنا ایک فعل عبث ہے، تقریر کا کوئی خاص مقصد ہونا چاہئیے اور تقریر کے خاتمہ میں عمل و حرکت کی بھی دعوت دینی چاہئیے، اور موضوع کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد کچھ عملی منصوبے بھی دینے چاہئیں اگر حاضرین اس منصوبہ پر عمل کرنیکے لئے تیار ہو گئے تو مقرر کی تقریر بلاشبہ کامیاب و موثر ہوگی،

کامیاب زندگی کیلئے ضروری صفات

ہم میں سے ہر شخص کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کامیاب زندگی کی توضیح اور تشریح کرنا مشکل ہے کیونکہ ہر شخص کا معیار اور نقطۂ نظر جدا ہوتا ہے، تاہم معیار خواہ کتنا ہی بلند ہو اور نقطۂ نظر کتنا ہی جداگانہ کیوں نہ ہو، زندگی کو کامیاب بنانے کیلئے مندرجۂ ذیل اوصاف ضروری ہیں،

۱۔ تجسس کا شوق، بچوں میں تجسس اور تلاش کا غیر معمولی شوق ہوتا ہے، وہ پیہم اتنے سوالات کیا کرتے ہیں، کہ بعض اوقات ان کے بزرگوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے، لیکن بچوں کا زیادہ سے زیادہ سوالات کرنا بہت ہی حوصلہ افزا ہے، جو بچے جتنے زیادہ متجسس اور تلاش و تحقیق کے مشتاق ہونگے اتنا ہی زیادہ وہ سوالات کریں گے، اور اسی سے ان کی اندرونی قوت کا اندازہ ہوتا ہے، تجسس کا شوق ایک غیر معمولی قوت ہے جس سے اگر فائدہ اٹھایا جائے، تو دنیا کی ہر بڑی کامیابی آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے، سائنس داں تجسس ہی سے کائنات اور فطرت کے رموز دریافت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، ایک مورخ تجسس ہی سے تحقیق و تدقیق کا بہتر سے بہتر نمونہ پیش کرتا ہے، اہل حرفہ کی ساری کامیابی کا انحصار اسی تجسس پر ہے، غرض تجسس میں کامیابی کا اصلی راز ہے،

۲۔ لطف اندوزی، زندگی کی جس کامیابی میں لطف حاصل نہ ہو، وہ بیکار اور فضول ہے، اسلئے ایسی کامیابی کے حصول میں وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہیے جس میں لطف و مسرت کی توقع نہ ہو، لطف و مسرت کی توقع اندرونی قوت کو عمل میں لانیکی سب سے بڑی محرک ہے، اگر یہ توقع نہ ہو تو عملی قوتیں جبری اور مصنوعی ہو جاتی ہیں،

۳۔ ولولہ، لطف اندوزی کی توقع ہی سے ولولہ پیدا ہوتا ہے، زندگی کی کوئی کامیابی بغیر ولولہ کے حاصل نہیں ہو سکتی، دنیا کے تمام کارنامے ولولے ہی سے انجام پاتے ہیں، دونوں کی شدت اور فراوانی ہی

سے کامیابی قدم لیتی ہے،

۴۔ افضلیت کی خواہش، مگر ولولہ سے کامیابی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب وہ اصلی اور عملی ہو دنیا میں کوئی شخص بغیر ولولہ کے کامیاب نہیں ہو سکتا، لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ ایک شخص ولولوں کی شدت کے باوجود کامیاب نہ ہو، اسکے لئے سبقت کا جذبہ ضروری ہے، افضلیت کی خواہش اور تفوق و برتری کے جذبہ ہی سے ولولوں میں گرمی پیدا ہوتی ہے،

لیکن سبقت لیجانے کی کوشش میں احتیاط ضروری ہے، ہمکو اسی کام میں سبقت لیجانیکی کوشش کرنی چاہئے جس میں ہم کو یہ یقین ہو کہ ہماری صلاحیت کی اعانت ہم کو منزلِ مقصود تک ضرور پہونچا دیگی، اسلئے ہم جس کام میں امتیاز حاصل کرنا چاہتے ہوں، اسکو خوب اچھی طرح سوچ اور سمجھ کر شروع کرنا چاہئے، ورنہ محض خیالات کی دنیا میں رہنے اور خواہشوں کے گہوارہ میں جھولنے سے نہ ولولہ میں سرگرمی اور نہ افضلیت کی تکمیل ہو سکتی ہے،

۵۔ اعتماد ذات، ہم کو جب تک اپنی ذات پر پورا بھروسہ نہ ہو، ہم کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے، زندگی کی رنگینی اور خوشی کا انحصار اعتماد ذات ہی پر ہے، بعض اشخاص ایسے ہیں جنھوں نے اعتماد ذات کے بغیر کامیابی حاصل کی ہے، لیکن ان کی کامیابیوں میں ذہنی انتشار و اختلال کے عناصر زیادہ ہوتے ہیں، اعتماد ذات ذہن و ادراک کی تربیت، عزم و استقلال اور اپنی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ لگانے سے پیدا ہوتا ہے،

۶۔ اگر مندرجہ بالا تمام اوصاف موجود ہوں، لیکن ہم صبر کے خوگر نہیں ہیں، تو کامیابی کی شاہراہ پر گامزن ہونا مشکل ہے، ہم جب کوئی کام شروع کریں گے، تو بہت ممکن ہے کہ اس میں دقتیں حائل ہوں، اگی نہیں میں تاخیر ہو، یا آخر میں ناکامی ہو، مگر یہ ساری مشکلات صبر و سکون سے دور ہو سکتی ہیں، اور اگر یہ اوصاف موجود نہیں تو ہماری تمام کوششیں بے مدار ہو کر رہجائینگی، "ص ع"

اخبار علمیہ

مصر میں آثار قدیمہ

دریائے نیل کے دہانے کے قریب سینل ہاگر (San-el Hagar) میں آج کل کھدائی کا کام جاری ہے، یہاں ایک مقبرہ سے ایک لاش بالکل محفوظ نکلی ہے، یہ لاش سر سے پاؤں تک سونے سے ڈھکی ہوئی ہے، چہرہ پر سونے کی ایک نقاب ہے، جسکی شکل باز کے سر سے ملتی ہے، اسکے ساتھ خستہ حالت میں دو اور ڈھیر نکلے ہیں، ان میں سے ایک کے گلے میں عقیق کا ہار ہے جس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ دونوں ملازم تھے، لاش چاندی کے کفن میں لپٹی ہوئی ہے، فراعنہ کے مقبروں سے اب تک جتنی لاشیں برآمد ہوئی ہیں ان میں سے کسی کا کفن چاندی کا نہیں تھا، مصر قدیم میں چاندی سفید سونا کہلاتی تھی، جو بہت کمیاب اور سونے سے زیادہ قیمتی ہوتی تھی،

ڈاکوؤں نے مصر کے اکثر مقبروں کو شدید نقصان پہنچایا ہے، لیکن یہ مقبرہ بالکل صحیح و سالم ہے، مقبرہ کی دیواروں پر سوسن نس (Psou-sen-nes) کا نام لکھا ہوا تھا، کھودنے والوں نے سمجھا کہ یہ لاش اس بادشاہ کی ہے جو حضرت سلیمان کے سینکڑوں داما دوں میں سے ایک تھا، لیکن اسکے زیورات پر شی شونک لکھا ہوا پایا گیا، اور یہی اصلی نام قرار پایا، اس میں سے کچھ ظروف بھی نکلے ہیں، مصر کے حکمران شاہ فاروق کے سامنے تین ظروف کھولے گئے، ان میں سے ہر ایک میں لاش کی شکل کا ایک بکس نکلا، مقبرہ کے ایک گوشہ میں ایک گھڑا بھی پایا گیا ہے، جو مٹی سے بالکل بند ہے، اسکو ابتک نہیں کھولا گیا ہے، گمان کیا جاتا ہے کہ اس میں اسلحہ ہوں گے،

مصر کے بائیسویں شاہی خاندان (۹۵۰ قبل مسیح) میں پانچ شی شونگ گذرے ہیں، مذکورہ بالا
لاش اگر شی شونگ اول کی ہے، تو یہ وہی ظالم اور فاتح شی شونگ ہے، جس کا ذکر انجیل میں ان
الفاظ میں آیا ہے کہ شاہ ری ہوبوم کی حکومت پانچویں سال میں مصر کے بادشاہ شی شنک نے بیت المقدس
پر چڑھائی کی، خدا اور بادشاہ کے گھروں کے خزانے لے گیا، اور وہ سونے کی ڈھالیں بھی جن کو حضرت
سلیمان نے بنایا تھا، لے گیا" اگر یہ لاش واقعی اسی شی شنک کی ہے تو یہ انکشاف تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہوگا

سمندر میں ریڈیم کی تلاش

آج کل ڈاکٹر چارلس پیگوٹ (کارنجی انسٹیوشن، امریکہ) سمندر کی تہ سے ریڈیم نکالنے کی فکر میں ہے
ریڈیم سب سے قیمتی دھات ہے، ایک پونڈ کی قیمت ایک کرور ڈالر ہے، شروع میں تھوڑا سا ریڈیم کولوراڈو
یوٹاہ کی کانوں سے نکلا تھا، جو اب تک سرطان کے علاج اور گھڑیوں میں استعمال کیا جاتا ہے، اسکے بعد
بلجیم کانگو میں کچھ زیادہ مقدار میں دستیاب ہوا، پھر کنیڈا کے شمالی مغربی علاقہ میں اس دھات کی بہتر قسم ملی
اب امید کیجاتی ہے کہ چارلس پیگوٹ کی کوشش سے یہ دھات سمندر کی تہ سے بہت زیادہ
مقدار میں برآمد ہوگی، پیگوٹ سمندر کے نچلے طبقات کا ماہر ہے، اتفاق سے بحری تار کے محکمہ والوں
کے ذریعہ سے اسکو سمندر کی تہ کی کچھ گاد مل گئی، اس نے اس کا کیمیاوی تجزیہ کیا، تو پتہ چلا کہ اسمین
زمین کی تمام دھاتوں سے زیادہ شعاع زنی کے اجزا ہیں، پیگوٹ نے زمین کی تہ سے کیچڑ نکالنے
کی غرض سے ایک عجیب و غریب آلہ ایجاد کیا ہے، اس نے ایک آبدوز بندوق تیار کی ہے جس میں بہت سی نلکیاں
ہیں، بارود بھر کر اسکو سمندر میں ڈالدیا جاتا ہے، نیچے پہونچکر بارود مشتعل ہوجاتا ہے، نلکیاں پھٹ جاتی ہیں اور سمندر
کی تہ کی کیچڑ نلکی میں بھر جاتی ہے، اب تک یہ نلکیاں سمندر کے اندر تین میل تک جاسکی ہیں، لیکن
پیگوٹ سات میل اندر کی کیچڑ نکالنا چاہتا ہے، اسکے لئے اس نے لوہے کی ایک سکری بنائی ہے جو نیچے
۵/۱۶ انچ اوپر ۱/۱۶ انچ موٹی ہے، اس کا وزن پانچ ٹن ہے، یہ ایک پہیہ دار مشین میں لپٹی ہوئی ہے، جو

ایک سو گھوڑوں کی طاقت کے انجن سے چلتی ہے، اب اسی کے ذریعہ سے پیگوٹ اپنی نلکیوں کو اندر ڈالینگا
پیگوٹ کی رائے ہے کہ نہ صرف ریڈیم بلکہ لوہا، تانبا، اور ٹین وغیرہ دوسری دھاتیں بھی سمندر کی تہ سے
برآمد ہونگی، اگر پیگوٹ کو اس میں واقعی کامیابی ہوگئی، تو دنیا میں بہت سی بیش قیمتی دھاتوں کا بڑا اضافہ
ہوجائے گا، اور ایسے زمانہ میں یہ اضافہ بہت مفید ہوگا، جبکہ ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ مستقبل قریب
میں بہت سی دھاتیں بہت جلد ختم ہوجائیں گی، کیونکہ یورپ میں سنہ ۱۸۵۰ء اور امریکہ میں سنہ ۱۹۱۰ء کے بعد
سے تیل کے سوا کسی اور دھات کی کوئی کان معلوم نہیں ہوسکی ہے، مثلاً امریکہ میں ۱۲ ارب ٹین کے
پیپے استعمال ہوتے ہیں، اگر اسکی مزید کانیں دریافت نہ ہوئیں، تو ٹین کی کمی بہت جلد محسوس ہونے
لگے گی، اگر پیگوٹ کی کوشش سے مختلف قسم کی دھاتیں سمندر سے برآمد ہوگئیں، تو پھر آئندہ کی ایک بڑی
مشکل حل ہوجائیگی، اس سے بین الاقوامی سیاست کی بھی صورت بدل جائیگی، بڑے بڑے سمندروں پر قبضہ
حاصل کرنے کیلئے معلوم نہیں کتنی خونریزیاں ہونگی،

جانور اور آکسیجن

ڈنمارک کا مشہور سائنس دان اوگسٹ اسٹین برگ کرگ آجکل ممالک متحدہ میں "جانور اور آکسیجن"
پر مختلف یونیورسٹیوں میں لکچر دے رہا ہے، کرگ کو سنہ میں نوبل پرائز مل چکا ہے، اسکی تحقیق تھی کہ پھیپھڑے کے
عروق شعریہ ایک ساتھ مل کر کام کرتے ہیں، اور جب بیٹھے ساکت رہتے ہیں، تو ان میں سے اکثر عروق شعریہ
بند ہوجاتے ہیں، سنہ ۱۹۱۶ء میں اسکی ایک اہم کتاب تنفس پر شائع ہوئی، جسمیں یہ دکھایا ہے کہ پھیپھڑوں میں
سانس کے بجائے گیس بھی پہونچائی جاسکتی ہے،
اس سفر میں کرگ امریکہ کے لوگوں کے سامنے یہ تحقیق پیش کر رہا ہے کہ آکسیجن کی کمی اور زیادتی سے
جانوروں پر کیا اثر پڑتا ہے، اسکا مشاہدہ ہے کہ جس پانی میں آکسیجن کی کمی رہتی ہے اس کے مینڈک خلاف معمول
بہت بڑے ہوتے ہیں، اور جسمیں زیادتی ہوتی ہے، اسکے مینڈک بہت چھوٹے ہوتے ہیں، جنوبی امریکہ کی

سشش دار مچھلیاں جب انڈے سینے کیلئے پانی کے نیچے چلی جاتی ہیں، تو آکسیجن کی کمی کے سبب انکے گلپھڑے بہت بڑھ جاتے ہیں، اور ہیل مچھلی جب غوطہ لگاتی ہے تو آکسیجن صرف ان کے دماغ تک پہنچتا ہے جس سے انکے دل کی حرکت کم ہو کر ہر منٹ میں ۶۰ کے بجائے ۴ یا پانچ ہو جاتی ہے،

کرگ نے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ جانور کو آکسیجن کی کتنی ضرورت ہوتی ہے، سیپ کے ایک کیڑے [illegible] کو ایک منٹ میں ۲۲ کیوبک سنٹی میٹر اور شہد کی مکھیوں کو سترہ ہزار کیوبک سنٹی میٹر آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے، انسان ۲۰۰ سے ۳۰۰۰ سنٹی میٹر تک آکسیجن استعمال کرتا ہے،

خوردن برائے زیستن

گذشتہ گرمیوں میں سیلاب کی وجہ سے ہزاروں چینی بھوکے مر گئے، اسپین کی جنگ میں میڈرڈ کے محاصرہ کے موقع پر ہر ہفتہ ۲۰۰۰ آدمی فاقہ سے مرتے تھے، ان واقعات سے متاثر ہو کر مجلس اقوام نے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا تھا، اس نے یہ معلوم کیا ہے کہ ایک آدمی کی زندگی بچانے کیلئے کم سے کم کیا اور کتنی غذا ہو سکتی ہے، اس کی رائے میں بالغ آدمیوں کیلئے ۸ اونس گیہوں کا آٹا ہونا چاہئے تاکہ جسم میں کاربوہائیڈریٹ پہنچا رہے، ½ اونس نمک چاہئے تاکہ جسم میں پانی کا توازن قائم رہے، حیاتین ب کے لئے ½ اونس شراب کا خمیر، حیاتین الف کیلئے ۱/۱۰ اونس مچھلی کا تیل، اور حیاتین ج کے لئے ہفتہ میں دو لیموں چاہئیں، اگر دو اونس خشک بالائی کا سفوف مل جائے تو شراب کے خمیر کا بدل ہو سکتا ہے، بچوں کو مچھلی کا تیل اور بالائی کا سفوف نسبتہً زیادہ چاہئے، ان کو نمک کم دیا جائے، تو کوئی حرج نہیں، اگر لیموں اور نارنگیاں نہ میسر ہوں تو درخت کی سبز پتیاں پانی میں جوش دیکر چاے کی طرح استعمال کیجا سکتی ہیں،

یہ تمام چیزیں پیٹ بھرنے اور ذائقہ کیلئے تو نہیں ہیں، لیکن ان سے زندگی محفوظ رہ سکتی ہے اور فاقہ زدگی کے بہت سے امراض مثلاً خون کی کمی، خون کا فساد، جلد کی خرابی، اور سوکھے کی بیماری وغیرہ کو روکا جاسکتا ہے،

"ض، ع"

ادبیات

حکمت سلیمانی

از مولینا کیفی چریاکوٹی

"ذیل کی نظم میرے فاضل دوست استاد بھائی اور استادزادہ کی ہے، وہ استاذی مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی کے صاحبزادہ اور میرے بچپن کے دوست اور ہم سبق ہیں، انھوں نے بے وجہ میری "مدح" کا ننگ گوارا کیا ہے، اور اس پر ان کا اصرار ہے کہ یہ معارف میں شائع کی جائے، میں اپنی بے بضاعتی کے اعتراف کے ساتھ، اپنے مفروضہ محاسن کے اعلان کیلئے نہیں، بلکہ شاعر کی شاعرانہ قوت بیان کے اظہار کے لئے اس کی اشاعت کو جائز رکھ رہا ہوں، اللّٰھم اغفر لی،

"س"

مشرق کی تابش خورشید تابان	مغرب کا شہرہ ماہ درخشان
ہندوستان میں ندوے[1] کا حاصل	ندوۂ علما، ناز مسلمان
پٹنہ کا گلبن، دسنہ[2] کا گلشن	یعنی بہاری، موج بہاران

[1] دار العلوم ندوۃ العلماء، "م"

[2] ممدوح کا وطن، "م"

نورِ چراغِ فاروقؒ[1] یکتا   شاگردِ شبلی استادِ دوراں

مسکن وطن میں تنویرِ اعظم[2]   صوبے کا مرکز، بھارت کا یونان[3]

تحریر میں ہے ثانیٔ شبلی   تقریر راز جادو بیانان

تاریخ دانی، بحث کی حدیں   علم ادب میں کامل زباندان

حکمت کے فن میں حکم خرد ہے   منطق میں فاضل تا حدِّ امکان

حلّالِ آیات اقوالِ برحق   اسکی زبان پر تفسیر قرآن

تحدیثِ سنت، شکلِ محدث   تحدیدِ مسلک، تقلیدِ نعمانؒ[4]

جزئی مسائل میں شانِ تفقہ   شانِ تفقہ میں تکمیلِ ایمان

فخرِ کمالِ علم سیاست   علمی مجالس، اس پر ہیں نازان

اردو ادب میں اردو زباں ہیں   ہر قول فیصل، ہر قول برہان

بزمِ سخن میں مسند نشیں ہے   صدر نشینِ کل نکتہ دانان

نقد و نظر میں اسلوبِ محکم   رائے سدید و امرا میران

حکمِ شریعت میں احتسابی   رنگِ طریقت ساقیٔ عرفان

ذوقِ معارفؒ[5] حسنِ معارف   شانِ ادارت تسخیرِ دوران

طرزِ سخن میں بے مثل شاعر   نثر نگاری، سحر نمایان

تصنیف دیکھو بہتر سے بہتر   "سیرت نبی" کی اور "ارض قرآن[6]"

[1] مولینا فاروق چریاکوٹی مرحوم ممدوح کے استاذ اور استاذ الاستاذ، "م" [2] اعظم گڈھ کی طرف اشارہ ہے [3] قصبہ چریاکوٹ کسی زمانہ میں اپنے علما کی وجہ سے یونانِ ہند کہلاتا تھا، "م" [4] حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ "م" [5] رسالہ معارف "م" [6] ممدوح کی مشہور تصنیف ارض القرآن، "م"

چین جبیں میں، برقِ متانت   خوش ذوقیاں بھی ہیں دل میں پنہاں

سید گھرانا، مشہور عالم   صورت بھی بالکل سیرت کی شایان

اغیار ہوں تو تصویر غنچہ   احباب ہوں تو گلزار خندان

کل وضعداری، کل پاسداری   اخلاق جادو، تسخیر، احسان

خودداریوں میں دلداریاں ہیں   پھر خاکساری، لطفِ نمایان

کارے بجائے یارے بجائے   دستِ بزرگاں، بر فرقِ خردان

ہر گام راہے، ہر راہ گامے   تائیدِ یزداں، تائیدِ یزدان

ہر جائے شبلی آں خوش نشینے   محسودِ اعدا، محبوبِ یاران

آں رہ نوردِ اقصائے عالم   از شہر لندن تا ملک افغان[1]

حبرٌ جوادٌ، اخٌ کریمٌ   فضلُ العصرِ عونُ الاخوان

الحمدللہ! الحمدللہ   کیفی کے بھائی سید سلیمان

یا ذا الجلال یا ذا الکمال

احفظہ دوماً من کل خسران

[1] ممدوح کے سفر یورپ اور افغانستان کی طرف اشارہ ہے، ۱۹۱۹ء میں وفد خلافت کے سلسلہ میں لندن کا سفر کیا، اور ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ مرحوم کی دعوت پر وہاں کے نصاب تعلیم میں اصلاح و مشورہ کے لئے افغانستان کا سفر کیا، "م"

مطبوعات جدیدہ

تراجم علمائے حدیث ہند، مولفہ مولوی ابو یحییٰ امام خان صاحب نوشہروی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۵۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، پتہ :۔ عبدالحئی والاخوان مقام سوہدرہ گوجرانوالہ پنجاب،

مولوی امام خان صاحب جماعت اہلحدیث کی مفید علمی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں، اب سے چند سال پہلے وہ ہندوستان کے اہلحدیث کی علمی خدمات پر ایک کتاب لکھ کر شائع کر چکے ہیں، اب اونھوں نے اہلحدیث علماء کے حالات میں یہ مفید کتاب تالیف کی ہے، لیکن جیسا کہ استاذ معظم مولینا سید سلیمان ندوی نے اس کتاب کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے کہ "ان (مولف) کے موضوع کا دائرہ جتنا تنگ ہے، ان کے عمل کا دائرہ اتنا تنگ نہیں ہے"، یعنی اس میں تنہا جماعت اہلحدیث کے علماء کے حالات نہیں ہیں، بلکہ متقدم علماء کے علاوہ ان عامل بالحدیث اور متبع سنت علماء کو بھی شامل کر لیا گیا ہے، جو موجودہ اصطلاحی معنوں میں جماعت اہل حدیث کے زمرہ میں نہیں آتے، عرصہ ہوا، حضرۃ الاستاذ نے ہندوستان میں علم حدیث کے عنوان سے معارف میں ایک مسلسل مضمون لکھا تھا، جو ناتمام رہ گیا تھا، مذکورۂ بالا کتاب ایک پہلو سے اس کا تکملہ ہے، اگر اس میں متقدم اساطین حدیث کو بھی شامل کر لیا جاتا تو پورا تکملہ ہو جاتا، بہرحال اس کتاب میں علحدہ علحدہ دہلی اور صوبہ متحدہ کے تمام بڑے بڑے شہروں اور مقامات کے قدیم اور موجودہ علمائے حدیث اور مشہور محدث خانوادوں کے حالات ہیں، اس کا آغاز ہندوستان کے سرچشمۂ حدیث

دودمان ولی اللٰہی سے کیا گیا ہے، اور اس سلسلہ کے کسی قدر تفصیلی حالات ہیں، اس کے بعد دوسرے خانوادوں اور علماء کا تذکرہ ہے، ہر ترجمہ میں صاحبِ ترجمہ کے مختصر سوانح اور تعلیم و تدریس، شیوخ و تلامذہ، علمی و دینی خدمات اور تصانیف کا اجمالی ذکر ہے، مصنف نے بڑی محنت اور تلاش سے یہ کتاب لکھی ہے، اور وہ مختلف حیثیتوں سے مفید اور قابلِ قدر ہے، تراجم کے ضمن میں بہت سے علماء، صلحاء اور مجاہدین کے علمی و دینی خدمات، مجاہدانہ کارناموں کے حالات اور ہندوستان کی ڈھائی سو برس کی علمی اور دینی تاریخ کے بعض پہلو آگئے ہیں، ہندوستان کے کسی اسلامی فرقہ کی تاریخ لکھنا بڑا نازک کام ہے، مشکل سے کوئی شخص اسکے کانٹوں سے دامن بچا سکتا ہے، ناقابلِ ذکر اور ناگوار واقعات کا ذکر آجانا تو خیر ایک حد تک ناگزیر ہے لیکن ایسے مواقع پر الفاظ میں احتیاط اور قلم پر قابو رکھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے، اگرچہ لائق مؤلف نے حتی الامکان اس میں بہت احتیاط برتی ہے، پھر بھی بعض بعض مقامات پر قلم میں لغزش آگئی ہے، امید ہے یہ کتاب اہلِ علم میں عموماً اور جماعت اہلِ حدیث میں خصوصاً مقبول ہوگی،

مشیر الحاج، از مولانا شاہ محمد عبدالحامد القادری بدایونی تقطیع بڑی ضخامت ۹۲ صفحے، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت معمولی، قیمت :۔ عہ، پتہ محمد عابد القادری ناظم دار التصنیف مولوی محلہ، بدایوں،

مولینا عبدالحامد صاحب بدایونی ۳۹ھ میں حج بیت اللہ اور حرم نبوی کی زیارت سے مشرف ہوئے، اس مقدس سفر کی روئداد وہ روزنامچہ کی شکل میں لکھتے گئے تھے، مشیر الحاج اسکی کتابی صورت ہے، حج کے سفرناموں اور روزنامچوں کے مضامین متعین اور معلوم ہیں، ذاتی حالات نساتھ ہی اور مختلف مقامات کے لوگوں سے ملاقاتوں کا ذکر، سفر کی دلچسپیاں، راحت و تکلیف، مقاماتِ مقدسہ

کے حالات حکومت کے نظام پر تنقید، حج کے کوائف اور اس قسم کی دوسری باتیں بھی ہیں، اس سفرنامہ میں آخر میں مناسک حج، اس سے متعلق مسائل، دعائیں، اور مدینہ طیبہ کے آثار کا ذکر، اور حجاج کی سہولت کے لئے مفید ہدایات ہیں، اور اخراجات سفر کی تفصیل بھی دیدی ہے،

ہندوستان میں برطانوی حکومت } مؤلفہ جناب ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب، پی ایچ، ڈی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۱۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸/

پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی، لکھنؤ، لاہور،

ہندوستان میں غیر ملکی حکومت کا سب سے تباہ کن نتیجہ یہاں کی اقتصادی بربادی اور عام غربت و افلاس ہے، ڈاکٹر زین العابدین صاحب نے اس کتاب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک کی ہندوستان کی اقتصادی تباہی اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے، گو یہ کتاب مختصر ہے، لیکن اس میں ہر پہلو یعنی صنعت و حرفت، زراعت و تجارت کی بربادی، حکومت کے محاصل اور اس کے مصارف، غیر ضروری گرانبار اخراجات، قرضوں کا ناقابل برداشت بار، درآمد و برآمد کے محصول کے غیر منصفانہ قوانین، تجارت میں ہندوستان اور انگلستان کے درمیان غیر مساویانہ برتاؤ، سکہ و شرح مبادلہ کی تباہ کن پالیسی، محاصل پر حکومت کا جابرانہ اقتدار وغیرہ پر بحث کر کے اسکے نتائج کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ دکھایا ہے، اور جابجا انگریز حکام اور مصنفین کے بیانات سے اسکی سندیں دی ہیں، برطانوی حکومت نے جن جن طریقوں سے ہندوستان کی دولت کھینچی ہے اور اسے حصول دولت کے ذرائع سے محروم کر کے جسطرح مفلس بنایا ہے جسکا سلسلہ اب تک قائم ہے، اس کتاب کے دیکھنے سے اسکا پورا اندازہ ہو جاتا ہے آخر میں دکھایا ہے، کہ جدید دستور میں بھی اس مرض کا کوئی علاج نہیں، آمدنی کے تمام بڑے بڑے ذرائع بدستور مرکزی حکومت کے قبضہ میں ہیں، اور اس کے بڑے حصہ کو مصارف کی وہی مختار ہے بلکہ

جدید دستور میں حکومت کے اختیارات پہلے سے بھی زیادہ وسیع ہو گئے ہیں اسلئے اس دستور سے بھی کسی قسم کی مالی فلاح کی امید نہیں ہو سکتی،

من کی بتیا، مؤلفہ لطیف النساء بیگم صاحبہ بی اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۸/، پتہ:- ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن،

ہماری معاشرتی خرابیوں میں عورتوں اور مردوں کے بیجا اسراف، لغو رسم و رواج، بیجا نمود و نمایش، ظاہری شان و شوکت، تن آسانی اور جدید تمدن کی غلط نقالی نے متوسط الحال سپید پوش گھرانوں کے امن و سکون کا خاتمہ کر دیا ہے، اس کی اصلاح کا دار و مدار بڑی حد تک ہماری خواتین کے سدھار، ان کی صحیح و صالح تعلیم و تربیت، پاکیزہ خیالی اور ان کی سادگی و جفاکشی پر ہے، محترمہ لطیف النساء صاحبہ جدید تعلیم کے باوجود ان اوصاف سے آراستہ اور صحیح نسوانی تعلیم کا اچھا نمونہ ہیں، انھوں نے مذکورۂ بالا کتاب میں ان تمام معاشرتی خرابیوں اور اسکے اسباب کو دکھا کر ان کی اصلاح کے طریقے بتائے ہیں، اگر ہماری عورتوں میں اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ایسی صحیح روشنی اور پاکیزہ خیالات پیدا ہو جائیں، تو ہماری زندگی سنور جائے، یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے لڑکیوں کے نصاب میں داخل کیا جائے،

اندھی دنیا، مصنفہ جناب اختر انصاری صاحب بی اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۵۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲/، مجلد، پتہ:- مکتبہ جہان نما اردو بازار جامع مسجد دہلی،

اختر انصاری صاحب ہونہار نوجوان ادیبوں میں ہیں، نظم و نثر دونوں میں ان کا مذاق ستھرا ہے، اندھی دنیا ان کے چوبیس ۲۴ افسانوں کا مجموعہ ہے، جن میں اکثر یا شاید کل رسالوں میں شائع ہو چکے

ہیں، ان کی نظمیں اور افسانے دونوں جدید ادب کے ترجمان ہیں، وہ ہندوستان کے اقتصادی اور سیاسی مسائل، یہاں کی غربت وافلاس کے نتائج، غربا سے ہمدردی، اور ہندوستانی نظامِ معاشرت کے قابلِ اصلاح پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں، یہ سب افسانے اسی رنگ کے ہیں، لیکن اس خشک مقصد کے باوجود ان کے لطف ودلچسپی میں کوئی کمی نہیں، زبان نہایت ستھری ہے، ان کی ایک قابلِ ذکر خوبی یہ ہے کہ آج کل کے بعض گم کردہ راہ انقلابی نوجوانوں کی طرح ان افسانوں میں محض بے معنی انقلاب کی دعوت اور اپنی تہذیب ومعاشرت، اپنے نظام اور اپنی چیزوں سے بیزاری نہیں ہے، بلکہ صرف قابلِ اصلاح پہلوؤں کو متانت وتہذیب سے پیش کیا گیا ہے،

خیابانِ نسوان مولفہ جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی، حیدرآبادی، تقطیع اوسط، ضخامت: ۱۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت: ۱۲؎، پتہ دفتر عصمت بک ڈپو دہلی،

یہ کتاب مولف کے ان اٹھارہ متفرق مضامین کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے مختلف نسوانی موضوعون پر مختلف رسائل میں لکھے تھے، ان میں تاریخی، تعلیمی، اخلاقی، اصلاحی اور مختلف قسم کے مضامین ومفید معلومات ہین، لیکن ان سب کا تعلق نسوانی مسائل سے ہے، عورتوں کے لئے ان مین بہت سے مفید معلومات ہیں،

تذکرۂ حالی، جناب ابو اللیث صاحب صدیقی ایم اے تقطیع بڑی ضخامت ۸۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، غالبًا مولف سے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے پتہ سے ملیگی،

ابو اللیث صاحب ایم اے بدایونی نے مولنیا حالی پر غالبًا یہ مقالہ لکھا تھا جسے کتابی صورت میں شائع کردیا ہے، اس میں مولنیا کے مختصر سوانح حیات ہیں، اور ان کی نظم ونثر اور تصانیف پر خوش مذاقی کیساتھ جامع اور مختصر تبصرہ کیا گیا ہے،

"م"

جلد ۴۳ | ماہ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ جون سنہ ۱۹۳۹ء | عدد ۶

مضامین